افسانہ و افسوں
بشیر احمد طاہر

افسانہ و افسوں

(مختصر افسانے اور مضامین)

بشیر احمد طاہر

ترتیب

ملنے کا پتہ

بشیر احمد طاہر

روڈ نمبر ۱ بنجارہ ہلز حیدرآباد ۳۴

(آندھرا پردیش)

قیمت ۲/۷۵ پ سکہ ہند

فون: ۳۵۲۷۲

مطبوعہ

اعجاز پرنٹنگ پریس

چھتہ بازار حیدرآباد ۲

آندھرا پردیش

سرِ ورق

یہ چند مختصر افسانے اور مضامین جو مختلف اوقات میں لکھے گئے تھے "افسانہ و افسوں" کے عنوان کے تحت جمع کئے گئے ہیں۔
ان میں سے ایک نظام کالج کے "نظام ادب" میگزین میں ایک عرصہ ہوا چھپا تھا ان افسانوں کے بارے میں قارئین جیسی بہ جبیں ہوں گے کہ ان کے منجملہ چند افسانوں پر افسانہ سے زیادہ ناصحانہ (DIDACTIC) رنگ غالب ہے۔ یہ افسانے جس زمانے میں لکھے گئے تھے اوس وقت طبیعت پر کچھ ایسا ہی رنگ غالب تھا اور ان ہی تاثرات اور خیالات کو ہلکے ہلکے افسانہ کے رنگ میں پیش کیا گیا ہے مجھے یہ احساس ہے کہ افسانہ کا رنگ گہرا ہونا چاہیئے اگر قارئین ان کو افسانوں کے طور پر پڑھنا پسند نہ کریں تو مضمون سمجھ کر ہی پڑھ سکتے ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ کسی افسانہ یا ناول میں افسانہ نگار اور ناول نویس خواہ کتنی ہی

غیر جانبداری سے کام لے اس کے خیالات اور تاثرات کہیں نہ کہیں چھپے رہتے ہیں لیکن اس سے افسانہ یا ناول کی دلچسپی میں فرق نہیں آتا۔

خوشتر آں باشد کہ سرّ دلبراں
گفتہ آید در حدیثِ دیگراں

(رومی)

بشیر احمد طاہر

بنجارہ ہلز۔ حیدرآباد
فروری سنہ ۱۹۶۸ء

افسانے

نشستند و گفتند......

جنگ کا زمانہ تھا ایک بڑے بیضوی شکل کے ہال میں جس کی وضع قطع زمین کی شکل کی تھی، انجمن بہی خواہانِ نوعِ انساں کی کانفرنس کا ایک اہم اجلاس ہو رہا تھا۔ کانفرنس کے در و دیوار اور نقش و نگار ویسے ہی تھے جیسے کانفرنسوں کے ہونے چاہئیں۔ دیواروں پر کچھ نقشے اور چھوٹی چھوٹی تختیاں لٹک رہی تھیں جن پر جوش اور غیرت دلانے والے انسانیت نواز مقولے اور اشعار خوش خط سے تحریر تھے۔ ایک کونے میں تپائی پر دنیا کے کرّے کا ایک بڑا گھومنے والا گولہ رکھا ہوا تھا۔ موضوع و مقاصد کانفرنس کی رعایت سے میز بھی بیضوی شکل کی تھی جس کے ارد گرد مختلف ملکوں سے اقطاعِ عالم کے سو سوا سو نمائندہ اصحاب بیٹھے ہوئے تھے جن کے پیچھے ان کے سکریٹری اور مددگار کچھ کاغذیں درست کرنے میں مصروف تھے۔ جلسہ گاہ میں ہزار بارہ سو آدمی جلسہ کی کارروائی شروع ہونے کا انتظار کر رہا تھا، اور ہال

کی فضا دبی ہوئی مدھم بات چیت کی آوازوں سے گونج رہی تھی، میز کے سرے پر ایک چھوٹے قد کے بزرگ بارلیش مختصر جن کی تالو صاف اور چکنی تھی اور کنپٹیوں کے بال سفیدی و سیاہی میں کھچڑی ہو رہے تھے اور ناک پر عینک لگی تھی کانفرنس کی صدارت فرما رہے تھے کانفرنس میں ہر نمائندہ ملک نوع انسانی کی محبت اور اخوت اور وحدت انسانی اور نوع انسانی کی ہمہ جہتی ترقی کے جذبات اور خیالات دل و دماغ میں لئے ہوئے اپنی تجاویز پیش کرنے کے لئے بے تاب ہو رہا تھا اور کانفرنس کے گذشتہ روز کے اجلاس کی تقریروں اور آج کے اجلاس میں پیش ہونے والی تجویزوں پر تبادلۂ خیال کر رہا تھا۔ ہر مندوب کا سکریٹری کاغذوں کے پلندے اور نوٹ مرتب کر کے اپنے مینبر کے سامنے رکھ رہا تھا۔

صدر کانفرنس تالیوں کی گونج میں اٹھے اور پچھلے دن کے اجلاس کی کارروائی پر مختصر تبصرہ فرماتے ہوئے انھوں نے نمائندگان اقوام سے خواہش کی کہ وہ اپنی اپنی تجاویز ذمہ دارانہ طور پر پیش کریں اور مسائل نوع انسانی کی گتھی کو سلجھانے میں مدد دیں۔

یہ کہہ کر صدر بیٹھ گئے اور علامہ عکس نامی ایک بزرگ جو صدر کی دائیں طرف بیٹھے ہوئے تھے اور جو ملک طوس کے مندوب تھے اپنی تحریک پیش کرنے کے لئے اٹھ کھڑے ہوئے، درحقیقت حضرت عکس

کی صورت میں ہی کوئی ایسی بات تھی جس سے وہ دنیائے جدید و قدیم کے خیالات کا عکس معلوم ہوتے تھے، پچاس پچپن کا سن، کشیدہ قامت دوہرا بدن، گھٹی ہوئی ڈاڑھی، نوکدار مونچھ، آنکھیں چھوٹی چھوٹی، تیز تیز نظریں اِدھر اُدھر دوڑاتے ہوئے، ہاتھ پیٹھ کی طرف باندھے تقریر کرتے وقت فصاحت و بلاغت کے پھول برسا رہے تھے، ان کی ہر تجویز بڑے گہرے غور و خوض پر مبنی ہوتی تھی اور وہ دنیا کی ہر بات کو الٹی نظر سے دیکھنے کے عادی تھے، ان کی تحریک کا منشا یہ تھا کہ کوئی ایسی تدبیر نکالی جائے جس سے انسان اپنے خیالات اور مشاہدات کو دماغ میں الٹا دیکھ سکے۔ مقرر نے بتایا کہ اس سے نوع انسانی کو کتنا بڑا فائدہ حاصل ہوگا اور دنیا علم و اخلاق کی صحیح منزل کی طرف کتنا اہم قدم اٹھائیگی علم کے بہت سارے معرکتہ الآرا نظریے اور اصول دنیا کو اسی طریقہ سے حاصل ہوئے ہیں، وہ یہ کہہ رہے تھے کہ انسان کی موجودہ مشکلات اور جمود کا سبب یہی ہے کہ وہ اپنے ایک مرتبہ قائم کئے ہوئے نظریوں اور اصولوں اور عادتوں کی الٹ پھیر نہیں جانتا اور اپنے خیالات اور مشاہدات کو الٹ کر یا بدل کر نہیں دیکھتا، اور دیکھتا ہے تو بعد از خرابی بسیار، اگر کسی تدبیر سے اس کے فکر و نظر کی دنیا الٹ دی جا سکے تو موجودہ زندگی کے اصولوں کی قدر و قیمت بھی الٹ جائے گی اور تہذیب و تمدن کے

بہت سارے حقایق جو محض خیالی الٹ پھیر سے اس وقت سر کے بل کھڑے ہوئے ہیں اپنی اصلی اور سیدھی حالت میں نظر آئیں گے اور موجودہ محاسن کے عیوب اور موجودہ عیوب کے محاسن دنیا کی نظروں پر کھل جائینگے حضرت عکس کا یہ فرمانا تھا کہ ہمارے علم و فن کے چالو نظرئے ہماری زندگی کے موجودہ اصول، حُسن و قبح اور نیکی و بدی کے نام نہاد اخلاقی تصورات۔ ان سب کو الٹ دو تو حقائق کی ایک اور ہی دنیا نظر آئے گی، مثلاً چوری، نقب اور ڈاکہ زنی موجودہ تمدن کی ایک تلخ اور ناگوار حقیقت ہے جس کا سدّباب قانون کے بھی بس کی بات نہیں، تاہم اس تصویر کا دوسرا رُخ دیکھیں تو یہ دولت کی مساوی تقسیم اور تقاضائے حیات کی تکمیل کی ناکام کوشش ہے جس کو اشتراکیت اجتماعی طور پر عملی جامہ پہنانے کی کوشش کر رہی ہے۔ کمزوروں اور مفلسوں کے حال پر رحم و کرم کے جذبات قوتِ عمل اور اقتدار انسانی کی تردید نہیں تو اور کیا ہیں؟ نام نہاد حق و انصاف اور امن و آشتی کی تعلیم سماج کی برائیوں اور ناانصافیوں کو قائم رکھنے کے لئے نہیں تو اور کس لئے ہے؟ صداقت اور نیکی کے پردے میں کتنے جھوٹ اور مکر و فریب پرورش پا رہے ہیں۔ برناڈشا نے بھی اسی حقیقت پر یہ کہہ کر کیا خوب پردہ اٹھایا ہے کہ شرافت و حیا بے حیائی کی پردہ داری ہے۔ غرض کہ موجودہ تہذیب کی سچائیاں جھوٹ اور

جھوٹ سچائیوں سے خالی نہیں ہیں، پھر کیوں موجودہ صداقتوں کو ہی سچ تسلیم کر لیا جائے؟ اور کیوں کل کی آنے والی نسلوں کے دماغ میں یہ جھوٹ باقاعدہ تعلیم و تربیت اور پروپگنڈے کے ذریعے بھرے جائیں؟ تحریک کا مقصد یہ تھا کہ عام انسانی خیالات اور تحت الشعوری رجحانات کو بدلنے اور ان میں قلب ماہیت پیدا کرنے کے لئے ماہران نفسیات و عمرانیات اور دانشوران علم و فن کی ایک کمیٹی بنائی جائے جو ماضی و حال کے علمی و اخلاقی تصورات اور ذہنی تعصبات کا تفصیلی جائزہ لے کر علم نفسیات جدید کے تجربوں کی روشنی میں ان تدابیر اور طریقوں کو معلوم کرے جو انسانی دل و دماغ کی قلب ماہیئت کو کامیاب بنا سکیں جس سے ایک انصاف پسند اجتماعی نظام کے قیام میں مدد مل سکے گی۔ اس کام میں کیمیا اور نئی ایجاد کمپیوٹر اور ماہر علم تحلیل نفسی کے مشوروں سے بھی خاص طور پر استفادہ کیا جائے۔

اس تجویز پر بہت کچھ بحث مباحثہ ہوا، اور محرک سے اس تجویز کے چند مضمرات کی وضاحت کرائی گئی جس کے بعد تحریک بہ اتفاق آرا منظور ہوئی۔

دوسرا ریزولیوشن جس کا عنوان "لمحۂ فکر" تھا ارسطوئے زماں، افلاطونِ وقت مرزا دانش پیش کرنے کے لئے اٹھے۔ صورت فلسفیانہ، آنکھیں شاعرانہ

اور نظر حکیمانہ تھی اور تقریر کرتے وقت ایسا معلوم ہوتا تھا کہ خیالات جیسے انکی زبان
سے ادا ہو رہے ہیں، سننے والوں کے دلوں میں گھر کر رہے ہیں۔ انھوں نے اپنی تجویز کا
مطلب واضح کرتے ہوئے بتایا کہ انسان دعوائے ہمہ دانی کے باوجود زندگی
کے متعلق اور اس کائنات کے متعلق بہت تھوڑا جانتا ہے اور ہر آن
کائنات کے بارے میں اس کے نظریات بدلتے رہتے ہیں، دنیا تمام کے
مفکّرین اور علما اور فلسفی ہر زمانے میں حیات اور کائنات کے متعلق
مختلف خیالات اور نظرئے پیش کرتے رہے مگر حقیقت کو نہ پا سکے بعینہ
ان اندھوں کی طرح جنھوں نے ایک ہاتھی کے اعضا کو الگ الگ چھوا
چھو کر ہاتھی کی حقیقت کے بارے میں قسم قسم کے مضحکہ خیز تصورات
قائم کر لئے تھے ٹھیک اسی طرح ان مفکّرین نے بھی حقیقت کو ادھر
اُدھر سے دیکھا اور کسی نے کچھ سمجھ لیا اور کسی نے کچھ۔ مگر حقیقت کو کوئی بھی
نہ پا سکا۔ حیات اور کائنات کے متعلق تمام علمی نظرئے، تمام اخلاقی تصورات
تمام عقلی اور روحانی اور وجدانی تاثرات اور مذہبی عبادات مقرر
کی نظر میں من گھڑت کہانیاں تھے جو ہر زمانے میں انسان نے اپنی
دل بہلائی کے لئے گھڑ لئے تھے۔ ماورائے عقل حقیقت کو انسان نہ
پا سکا اور نہ لامحدود کائنات اور لامتناہی حیات کے جلوے اس کو
کبھی نظر آ سکے۔

مقرر نے بلیغ انداز میں سلسلۂ تقریر جاری رکھتے ہوئے دریافت کیا، تو پھر کیا وہ تمام نظرئیے اور تصورات جو حضرت انسان نے حیات اور اخلاق کے بارے میں قائم کئے ہیں اور کیا وہ تمام تجربے اور معلومات جو اس نے ماضی کی نسلوں سے حاصل کئے ہیں آئندہ زندگی کے لئے کارآمد اور دلیل راہ ہوسکتے ہیں؟ بظاہر حیات انسانی کسی ہمہ وقتی نظرئیے اور اصول کی پابند نہیں معلوم ہوتی اور اس کی جدت طرازیاں اور تجدد نوازیاں عقل انسانی کو محوحیرت ہی رکھیں گی پھر انسانی زندگی کی منزل کیا ہوگی اور اس منزل کو پہونچنے کے راستے کونسے ہیں؟ اس سوال کا جواب حقیقت میں دشوار اور غور و فکر کا محتاج ہے۔

مرزا دانش کی تقریر اور تحریک کا منشاء یہ تھا کہ زندگی اور تمدن کو اس منزل کی طرف لے جانے کے لئے کم از کم یہ ضروری ہے کہ فلسفہ اور اخلاق کی کتابیں نذر آتش کر دی جائیں اور ان تمام خرافات کو جن سے یہ نظرئیے اور سیاست و تمدن کے اصول عبارت ہیں ردی دان کے حوالہ کر دیا جائے۔ اور انسان کو اپنی فطری طبعی اور عقلی میلانات کی زندگی بسر کرنے کے لئے آزاد چھوڑ دیا جائے۔ اس آزادی سے اسکی فطری اور عقلی صلاحیتوں کا ایک ایسا دھارہ بہے گا جو اس کی تمدنی زندگی کی کھیتی کو سیراب اور مالا مال کر دے گا۔ ایسی آزاد زندگی سے

خواہ انسانی تمدن و معاشرت بہتر ہونے پائے یا نہ پائے کم از کم اس کا امکان ہے کہ وہ معاشرے کے موجودہ وحشت ناک دورِ بربریت سے جس کو انسان اپنی خوش فہمی سے متمدن اور ترقی یافتہ سمجھے ہوئے ہے، کم مضرت رساں اور زیادہ شائستہ ہوگا۔

مرزا صاحب کی یہ تحریک اوّل تو کسی قدر غیر سنجیدہ سمجھی گئی اور اس پر دوسرے مندوبین نے کئی اعتراضات کئے اور کسی نے یہ کہکر بھی مذاق اڑایا کہ یہ فلسفۂ زندگی تو یورپ کے نئے بیٹیل (DEATEL) اور ہپی فرقوں کی دنیا پیدا کرے گا جو عہد حاضر کی تمام پابندیوں اور ظاہر داریوں سے باغی ہو کر ایک نراجی اور حیوانی قسم کا طرزِ زندگی اختیار کر رہے ہیں بالآخر محرک نے ان سب اعتراضات کا جواب دیتے ہوئے بتایا کہ اوّل تو حیوانوں اور درندوں پر یہ اتہام ہے کہ ان کی زندگی موجودہ انسانی تہذیب و تمدن کی زندگی سے بدتر ہے، دوسرے یہ کہ فطری زندگی سے مراد ایسی زندگی ہے جس میں فکر و نظر، علم و عمل، زبان و قلم اور میل جول کی کامل آزادی رہے گی، جس میں افلاس اور معیشت کے افکار نہ ہوں گے اور جہاں حسن و جمال کے چشمے بہتے ہوں گے اور جہاں سوسائٹی کے تمام افراد کو زندگی کی زیادہ سے زیادہ مسرتیں اور سہولتیں اور ترقی و تکمیل کے زیادہ سے زیادہ موقعے حاصل رہیں گے۔ مقرر نے

یہ بھی کہا کہ ان کی تحریک پہلی تحریک ہی کے رنگ میں تھی کیونکہ جب موجودہ زندگی کے رجحانات اور قدریں بدل جائیں گی تو انسان خود بخود آزاد فطری اور طبیعی زندگی کی طرف مائل ہو جائے گا اس وضاحت کے بعد جناب صدر نے اس تحریک کے بارے میں رائے شماری کی تو محرک کی اصل تحریک بلا کسی ترمیم کے منظور ہو گئی۔

اس کے بعد دو اور تحریکات ماچین اور جاوا کے مندوبین نے پیش کیں جو اگرچہ اہمیت میں ویسی معرکۃ الآراء نہیں تھیں جیسی پہلی دو تجاویز تھیں تاہم ان پر بحث میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی گئی۔ مثلاً ایک تجویز کے سلسلہ میں یہ بحث تھی کہ آئندہ کے نظام تمدن میں شاعروں اور کویتاؤں کے لئے کوئی جگہ ہو گی یا نہیں یا یہ کہ ان کو بھی شاعری کے شغل کے ساتھ ساتھ اپنا روزگار اپنی قوت بازو سے ہی پیدا کرنا ہو گا جیسا کہ اگلے زمانے میں بعض ادیب اور شاعر کرتے تھے اس تجویز کی تائید میں یہ کہا گیا کہ سائنس اور ٹکنالوجی کی دنیا میں نہ صرف شعر بلکہ دوسرے فنون لطیفہ کی بھی گنجائش نہ ہو گی اور اس کے خلاف میں یہ کہا گیا کہ یہ تحریک سابقہ دو تحریکوں کی اسپرٹ کے خلاف ہے جنکی رو سے ایک آزاد اور فطری نظام میں ہر شخص کو فکر و نظر اور علم و عمل کی آزادی حاصل رہے گی۔ دوسرے ایک مندوب نے بتایا کہ

سائنس کے انتہائی عروج پر پہونچ جانے کے بعد بھی شعر و ادب، نغمہ و موسیقی اور مصوری و بت تراشی جیسے فنون لطیفہ کی ضرورت باقی رہیگی اس لئے کہ انسان عقل و دانش کے علاوہ جذبہ و احساس لطیف کا بھی بندہ ہے اور اس کے دل میں افراد اور سماج کے تجربوں اور دوسروں کے احساسات اور تاثرات میں حصّہ لینے کی ایک فطری لگن اور چونپ موجود ہے۔ چند ترمیمات کی رو سے شاعروں کے ساتھ سیاست دانوں طبیبوں اور وکیلوں کو بھی شریک کرنا تجویز کیا گیا جن کی آئندہ ایک باشعور صحت مند اور مرنج و مرنجان سوسائٹی میں ضرورت باقی نہیں رہے گی۔ بحث مباحثہ کے بعد یہ تحریک غلبۂ آرا حاصل نہ کر سکی۔

ایک اور تجویز جس کو بلاد ہند کے ایک مشہور ماہر اقتصادیات رائے کوڑی پرشاد نے پیش کیا جو آئندہ سکّہ کے نظام سے متعلق تھی اور حقیقت میں عجیب و غریب تھی انھوں نے تحریک پیش کرتے ہوئے مختصر تقریر کی جس میں بتایا کہ صنعتی اور اقتصادی ترقی کے باوجود آج دنیا کے ہر گوشے میں بکھو کھا لوگ ننگے اور بھوکے نظر آتے ہیں اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ عیش و افلاس، اس ترقی کے دسترخوان کے ضروری لوازمات ہیں، دنیا کی مالیات اور دولت کی غیر مساوی تقسیم اور اس کی کمزوریوں اور سکہ کے مالیاتی پہلو کا ذکر کرتے ہوئے رائے صاحب نے ایک معرکتہ الآرا تجویز

پیش کی کہ اگر اجتماعی تقاضوں کو قبول کرتے ہوئے سرمایہ داری نظام کو قائم رکھنا مقصود ہو تو ان حکومتوں کو جو سرمایہ داری نظام کو خیرباد کہنا نہیں چاہتے اور غیر سرمایہ دار ممالک کو بھی چاہیئے کہ ان کی حکومتوں کے قیمتی سونے اور چاندی کے سکّہ کے چلن کو موقوف کر کے اس کی جگہ بڑے بڑے پوسٹر یا اخباری سائز کے کاغذ پر کم قیمت کے نوٹ چھاپ کر رائج کریں جو کسی صورت میں دو چار روپے یا اس کے مماثل سکّوں سے زیادہ قیمت کے نہ ہوں۔ آنے یا پائی کی قیمت کے نوٹ بھی ذرا کم سائز کے کاغذ پر چھاپے جا سکتے ہیں، اس سے چوری، ڈاکہ اور دغا فریب کے جرائم یک لخت بند یا کم ہو جائیں گے، کیونکہ کوئی چور نہ تو اتنے بڑے سائز کے کم قیمت نوٹ چرا کر چھپا سکے گا اور نہ وہ ان کو ہضم کرنے میں کامیاب ہو سکے گا اس سے پولیس اور عدالت کے محکموں کے کاروبار اور مصارف بھی کم ہو جائیں گے پھر یہ کہ کوئی شخص اس قسم کے سکّہ کو ذخیرہ کر کے دولتمند اور سرمایہ دار بننے کی خواہش اور کوشش بھی نہیں کرے گا۔ اس طرح سرمایہ داری کو آپ سے آپ ایک بڑی رکاوٹ پیش آئے گی، اس کے علاوہ ایک اور فائدہ یہ ہوگا کہ ممالک ایسے کم قیمت کے سکوں کے معاوضے میں تجارت کرنے کے بجائے جنس اور مال کے معاوضے میں تجارت کرنا پسند کریں گے جس سے ہر ملک کو دوسرے ملک کی ضروریات کے پیدا کرنے اور اپنے

مصنوعات کو ترقی دینے کا موقع ملے گا۔ اس طرح تمام ملکوں کے بیروزگار باشندوں کو صنعت اور کاروبار کی ترقی میں حصّہ لینے اور کام کرنے کا موقع ملے گا۔ غرض اس تجویز کے ساتھ ملک کے مالی نظام میں چند ضروری تبدیلیاں عمل میں لائی جائیں تو ملک کو کچھ خفیف خساروں کے عوض کثیر فوائد حاصل ہوں گے اور لوگ بے روزگار نہیں رہیں گے۔

محرّک نے اپنی تقریر میں بتایا کہ اس تجویز کی جدّت کا سہرا ان کے سر نہیں بلکہ اسپارٹہ کے مشہور مقنّن اور حکمران لِکرگس کے سر ہے جس کا نام یونان کی تاریخ میں زندۂ جاوید رہے گا اور جس نے اپنے زمانہ میں سکّہ رائج الوقت کو واپس لے کر ایک وزنی اور کم قیمت آہنی سکّہ بڑی کامیابی سے رائج کیا تھا۔

رائے کوڑی پرشاد کی اس تحریک کے مالی اور عملی پہلوؤں پر خوب بحثا بحثی ہوئی اور اس کو ناممکن العمل بتایا گیا مگر جب انھوں نے اس مسئلہ کے ما، دما علیہ پر ہر پہلو سے روشنی ڈالی اور دیگر مندوبین کے شکوک و شبہات کی تشفی کر دی تو کانفرنس نے یہ تحریک بھی باتفاق آرا منظور کرلی۔

اس کے بعد دو اور تجاویز دیگر ممالک کے مندوبین نے پیش کیں جن میں قبلام کے مشہور عالم عمرانیات پروفیسر اسحاق کی ایک اہم تجویز

جنگ کے بعد امن و آشتی کے انتظامات بحال کرنے سے متعلق تھی۔ مقرر نے موجودہ جنگ کی ہولناک جانی اور مالی تباہیوں کے اعداد پیش کرتے ہوئے انسانی زندگی کی تحقیر و پامالی پر انگریزی زبان میں ایسی درد انگیز تقریر کی کہ حاضرین پر رقت طاری ہوگئی۔ انھوں نے جنگ کے بعد انسان کے لئے ایک پُرامن دنیا بنانے کے لئے پُرامن سماجی اور سیاسی عقیدے کی ضرورت پر زور دیا جس کی رو سے چھوٹی بڑی اقوام کا مرتبہ برابر رہے اور جنگ کے تباہ کن آلات کے کارخانوں پر ہمیشہ کے لئے مہر لگا دی جائے اور جو ہتیار اور سامان حرب دنیا میں پہلے ہی سے موجود ہے اس کو کہیں دور سمندر میں لے جا کر غرقاب کر دیا جائے یا ہوا میں اڑا دیا جائے۔ مقرر نے چند بے نفس اور حقیقت پسند مشاہیر عالم کی کوششوں کا ذکر کرتے ہوئے یہ تجویز پیش کی کہ منجملہ تجاویز بالا کے نئے نظام میں جو لڑائی کے بعد قایم ہوگا ہر ملک اس بات کی ضمانت دے کہ وہ لڑائی میں پہل نہیں کرے گا اور اگر کسی ملک کے سیاستداں اور حکمراں اپنے ملک کے حقوق کی حفاظت کے لئے جنگ کو ناگزیر ہی سمجھتے ہوں تو وہ لڑائی کرنے کے بارے میں اپنے ملک کے تمام باشندوں سے رائے مشورہ کریں اور ملک کی جملہ آبادی کے کم از کم نو دفی صد اشخاص کی رائے کے مطابق عمل کریں۔

اس تجویز کے تمام مضمرات پر بحث ہو رہی تھی اور اس گرما گرم بحث میں اکثر مقررین حصّہ لے رہے تھے کہ ایک دفعہ ہی قیامت خیز گرج اور دھماکہ ہوا اور اس عمارت کے جس میں یہ لوگ بیٹھے ہوئے تقریریں اور مباحث کر رہے اور سن رہے تھے، پرخچے اڑتے نظر آئے اور اس کے در و دیوار افتاں و لرزاں کی گردان گردانتے ہوئے اڑاڑا دھڑم کرکے زمین پر آ رہے، شہر پر دشمن کا ایک ہوائی حملہ ہوا تھا جسکے اڑتے ہوئے جہازوں کی بھنبھناہٹ اور شہر کے سائرن کی گونج کی طرف اس کانفرنس کی تقریروں کی گرما گرمی میں کسی نے توجہ نہیں کی۔ بے چارے مقررین جو انسانی فلاح و بہبودی اور امن و ترقی کے بڑے بڑے منصوبے بنا رہے تھے دیگر حاضرین جلسہ کے ساتھ اپنی اپنی جگہ عمارت کے خشت و آہن کے ملبے میں دب کر بیٹھے کے بیٹھے رہ گئے۔ اس طرح ان کے نشستند و گفتند کے بعد برخاستند کی گردان تکمیل نہ ہو سکی۔

مہاتما کا مجسّمہ

شہر کی ایک بڑی شاہ راہ کے وسط میں جہاں سے شہر کی مختلف سمتوں میں مختلف سڑکیں گذرتی تھیں، ایک کٹھرے کے اندر ایک اونچا چبوترہ واقع تھا جس پر مہاتما کا کانسے کا مجسّمہ کھڑا ہوا تھا جس کے سیدھے ہاتھ میں عصا اور ناک پر عینک تھی، صبح سے شام تک اور شام سے آدھی رات گئے تک ہزار ہا موٹریں، لاریاں، ٹرک، رکشائیں، سیکلیں، بنڈیاں اور سینکڑوں آدمی اور ڈھور مویشی اس مجسمے کے سامنے سے گذر جاتے تھے اور ان میں سے کوئی کٹھرے کے جنگلے پر پان کی ایک آدھ پیک لگا تا یا ناک صاف کر جاتا تھا یا باہر کبھی جانور کھڑے ہو کر بول و براز کر جاتے تھے۔ سڑکوں کے چار طرف ہر قسم کی دوکانیں، ہوٹلیں، بنک، کارخانے اور اقسام کے کاروباری ادارے، شہد کی مکھیوں کے چھتّے کی طرح ہر قسم کی آوازوں اور نقل و حرکت کی گھما گھمی اور گونج سے بھنبھناتے رہتے تھے، ہر طرف فٹ پاتھ پر کہیں میوے اور پھول والے، کہیں کباڑئے، کہیں جوتشی اور کاہن

رمّال، کہیں کتب فروش، کہیں جلدفروش اپنا اپنا بھنڈار اکھولے ہوئے بیٹھے تھے اور ان ہی فٹ پاتھ پر کہیں لوگ سیکلیں چھوڑ کر کچھ خریدنے کے لئے دوکانوں میں یا کھانے پینے کے لئے ہوٹلوں میں گئے ہوئے تھے انہی فٹ پاتھ پر فقیروں، گداگروں، بھکاریوں، جذامیوں کی ٹکڑیاں جگہ جگہ بیٹھی ہوئی یا کھڑی ہوئی راستہ چلنے والوں یا موٹر نشین اصحاب کے سامنے دستِ سوال دراز کرتی رہتی تھیں جو کبھی کسی سے پیسہ دو پیسے پاکر دعائے خیر دیتے یا محرومیٔ سوال پر اپنے آپ میں گڑگڑاتے جاتے تھے، رات کے وقت یہی بھکاری اور جذامی انہی فٹ پاتھ پر اور مہاتما کے مجسّمے کے کٹہرے کے اندر سڑک کی روشنی اور آسمان کی شبنم میں سکڑ سکڑ کر سوتے رہتے تھے۔

ہر روز یہی تماشا مہاتما کے مجسّمے کی آنکھوں کے سامنے ہوتا رہتا تھا اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ مہاتما کی نگاہیں اِدھر اُدھر پلیٹ پلٹ کر اس تماشے کو دیکھ رہی ہیں۔ اس تماشے کے المناک مناظر سے مہاتما کی آنکھیں کبھی کبھی نم ہوتی معلوم ہوتی تھیں اور آنکھوں سے دو ایک آنسو ٹپک کر مجسّمے کے پاؤں کے ٹھیک انگوٹھوں پر گرجاتے تھے، کبھی کوئی بگڑا دل راہرو کٹہرے کے نزدیک کھڑے ہوکر مہاتما کے مجسّمے سے یوں مخاطب ہوتا کہ "مہاتما ہم مر رہے ہیں کوئی پوچھنے والا

ہنہیں! کیا ملک کو آزادی اسی دن کے لئے ملی تھی کہ ہم گوراشاہی کی غلامی سے چھوٹ کر غمِ روزگار میں گرفتار ہو جائیں؟" کبھی کوئی شخص شراب کے نشہ میں دھت، مجسّمے کے قریب آکر للکارتا "مہاتما! یہ لوگ میری شراب کے پیچھے پڑے ہوئے ہیں، حالانکہ شراب ہی غمِ روزگار کو بھلانے کا آسان نسخہ ہے۔ پھر حکومت کا نشہ شراب کے نشے سے زیادہ تیز ہوتا ہے۔ اس نشہ کو کون آمادہ ہے؟ (ہچکی)" ایک اور شخص جس کے پھٹے پرانے کپڑوں، گری ہوئی حالت اور افسردہ چہرے بشرے سے یہ معلوم ہوتا تھا کہ یہ ایک گردش زدہ درمیانی طبقے کا فرد ہے مجسّمے سے مخاطب ہو کر کہتا "مہاتما! آج کل کا دور سب سے زیادہ اس طبقے کے زندہ رہنے کے خلاف ہے جس کا میں فرد ہوں — وہ طبقہ جس کی جد و جہد اور رہبری و ایثار سے ملک نے آزادی پائی اور جو ہر دور میں علمی اور روحانی ترقی کا علمبردار رہا ہے۔" ان تلخ اور ٹیڑھے سوالات پر ایسا معلوم ہوتا کہ مہاتما کا مجسّمہ کچھ کہنے کو ہے لیکن حلق میں پھندا پڑ گیا ہے۔

ایک روز کا واقعہ ہے کہ ایک بڑی شاندار موٹر جس کے آگے ایک چھوٹی جھنڈی لہرا رہی تھی اگلی سڑک پر سے مجسّمے کی طرف آ رہی تھی جب یہ موٹر کٹھرے کے نزدیک سے گذرنے کو تھی کہ موٹر ڈرائیور کو ایسا معلوم ہوا کہ کوئی آدمی موٹر کے راستے کے بیچ میں ڈٹ کر

کھڑا ہوا ہے۔ ڈرائیور نے فوراً بریک ڈال دیا اور موٹر عین مجسمے کے نزدیک آکر رک گئی۔ ڈرائیور اس آدمی سے کچھ پوچھنے کو ہی تھا کہ وہ شخص غائب ہو گیا ایسا کہ تھا یا نہ تھا۔ مجسّمے کی طرف سے آواز آئی!
"تم کون ہو؟"

موٹر کے پیچھے کی سیٹ پہ ایک شخص کھادی کا لباس اور کھادی کی ٹوپی پہنے بیٹھا ہوا تھا۔ یہ آواز سُن کر اس نے فوراً دروازہ کھولا اور ایک پاؤں موٹر کے اندر اور دوسرا دروازے سے باہر نکال کر مجسّمے کی طرف رُخ کر کے کسی قدر بلند آواز میں کہا۔

"میں ایک منسٹر ہوں۔"

مہاتما نے نرم اور سخت لہجے کو ملا کر کہا "تم کو معلوم ہے کہ تم جس دیش کے منسٹر ہو اُس دیش کے لوگوں کا کیا حال ہے؟"

منسٹر (موٹر سے پورے طور پر اتر کر مجسّمے کی طرف نظر اٹھاتے ہوئے) بھلا یہ بھی کوئی پوچھنے کی بات ہے مہاتما! منسٹر ان کے حالات سے واقف نہ ہوگا تو اور کون ہوگا! بہر اوقت جو میں اسمبلی میں آیا ہوں تو انہی لوگوں کی سیوا اور سدھار کے قانون بنانے کے لئے اور جب اسمبلی سے فرصت ہوتی ہے تو سارے دیس کے دورے کر کے دھواں دھار تقریریں کرتا پھرتا ہوں اور ان کی سدھار کے پرچار کرتا رہتا ہوں۔

مہاتما۔ کیا تم بتا سکتے ہو کہ تمہاری اسمبلی اب تک کتنے قانون بنا چکی
ہے ہزاروں قانون بن چکے مگر دیس والوں کی حالت جُوں کی تُوں آش درکاسہ
ہے لوگ ضمیر کے قانون پر چلیں جو خدائی قانون ہے تو پھر تمہارے اتنے
قانون بنانے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ میں یہاں کھڑا ہوا دن رات لوگوں
کی حالت دیکھتا رہتا ہوں۔ کوئی خوش نظر نہیں آتا۔ ظاہری حیثیت سے
ان کی آمدنیاں ضرور بڑھ گئی ہیں مگر اس اضافہ کے مقابلے میں اشیائے
مایحتاج کی قیمتیں بھی کئی گنا بڑھ گئی ہیں جس کی وجہ سے ان کی حالت
وہی ڈھاک کے تین پات کی مصداق ہے۔ کاروباری ترقی کے ساتھ
قوم کی اخلاقی حالت گرتی ہی جاتی ہے۔ چند روز ہوئے میں نے اُس سڑک
کے فٹ پاتھ پر کیسا بھیانک منظر دیکھا تھا! ایک فاقہ کش غریب نے
لیٹے لیٹے بھیک مانگتے ہوئے کچھ بیماری سے کچھ فاقہ سے کچھ سردی سے
اکڑ ٹھٹھر کر اور زمین پر ایڑیاں رگڑ رگڑ کر جان دے دی تھی اور ایک
دن ایک رات اس کی بے گور و کفن لاش فٹ پاتھ پر ہی سڑتی پڑی
رہی۔ اس دوران میں ہزارہا مخلوق اس کے سر پر سے گزر گئی مگر کسی کو
اس غریب کی لاوارث لاش کو ٹھکانے لگانے کی ہدایت نہیں ہوئی
تا آنکہ میونسپل کارپوریشن والے اس لاش کو لاری میں ڈال کر لے گئے۔
منسٹر۔ مہاتما! اسی لئے زیادہ سے زیادہ قانون بنانے کی ضرورت

ہوتی ہے۔

مہاتما۔ ایک سیدھی سادھی اچھی سوسائٹی کے لئے کم سے کم قانون ہونا چاہیئے جتنے قانون زیادہ ہوں گے اتنے ہی جرائم کے ارتکاب کے موقعے زیادہ ہوں گے۔ اگر قوم کے افراد چور، جرکٹے، بدطینت اور بدذات ہوں تو دنیا کا کوئی قانون انھیں شریف اور بھلے مانس نہیں بنا سکتا۔ ہماری قوم تو ایسی نہیں پھر روزمرہ کی زندگی میں قانونی مداخلت کی بھی کوئی حد ہونی چاہیئے اور پھر ان قوانین کے بنانے کے خرچے کا بار بھی قوم ہی کو اٹھانا پڑتا ہے۔

منسٹر۔ یہ جمہوری نظام کے لوازمات ہیں۔

مہاتما۔ مگر جمہوریت کی اسپرٹ یعنی روح کہاں ہے! اب مجھے محسوس ہوتا ہے کہ ہم نے بھونڈے پن سے مغربی سیاست اور سوسائٹی کے ڈھانچوں کی نقالی کی ہے مگر ان میں وہ چڑیا ہی نہیں ہے جو برادری، برابری، آزادی اور پریم کے سریلے بول بولتی ہے یہ احساس مجھے مجسمہ بننے کے بعد ہوا منسٹر!

منسٹر۔ مہاتما! یہ باتیں کچھ میری سمجھ میں نہیں آئیں۔ میں اتنا جانتا ہوں کہ آپ کی طرح کٹھرے کے اندر چبوترے پر کھڑے ہو کر درس عبرت حاصل کرنا اور دنیا کو اخلاقی سبق دینا آسان ہے مگر

میری طرح جنتا سے روز روز کی دانتا کلکل اور پیسہ خرچ کر کے ایلکشن کا قلعہ سر کر کے اسمبلی میں تقریریں کرنا اور منسٹر بن کر دیس کی جو کڑیاں بھرنا، اور بھوک ہڑتالوں اور اسٹرائیکوں کے جھگڑے چکانا جبکہ لوگ بھوک فاقہ اور اسٹرائیک کے عادی ہو گئے ہوں اور ہر شخص کو خوش رکھنے کی کوشش کرنا مشکل کام ہے۔ اس ہڑبونگ اور دانتا کلکل میں انسانی قدریں کہاں باقی رہتی ہیں مہاتما!

مہاتما۔ تم لوگوں کے لئے سیاست ایک کھیل ہے جس کو عقل سے زیادہ چالاکی کی ضرورت ہے۔ تمہارے لئے سیاست توڑ جوڑ کا نام ہے اس کو انسانیت اور خالص ہمدردی سے کیا واسطہ!

منسٹر۔ ایک زمانہ میں آپ بھی سیاست کے پیشوا تھے۔

مہاتما۔ لیکن وہ سیاست روحانیت کی تکمیل کے لئے تھی یعنی یہ کہ ایک ایسا اقتصادی اور سماجی نظام پیدا کرنے کے لئے جس میں لوگ مطمئن اور خوش حال رہیں، جہاں ہر ایک کو اپنی محنت کی کمائی پر حق حاصل رہے، جہاں کسی کو کسی محنت کش کے مال اور حق پر نظر ڈالنے کی جرأت نہ ہو، جہاں ذات پات، رنگ نسل اور زبان کے تفرقے مٹ جائیں، جہاں برادری محبّت، خلوص ایثار و فدویت اور بے غرضی کے جذبات عام ہو جائیں۔ مجھے دکھ

ہوتا ہے کہ ہمارے دیس میں سوشیلزم کے نام سے اس قسم کے کسی نظام کے پیدا ہونے کے امکانات کو خلط ملط کیا جا رہا ہے جو میرا مقصود ہے جن ملکوں میں سوشیلزم کا نظام قائم ہے وہاں اس میں شک نہیں پیٹ کی بھوک بجھا دی گئی یا دھیمی کر دیگئی ہے لیکن روح کی ترشنا یعنی پیاس بجھی نہیں، وہی جبر و اقتدار، وہی تشدد، وہی قومی اور بین الاقوامی اور طبقاتی رقابتیں وہی جنگ و جدل اور تباہی کے خوفناک سامان وہاں بھی ہیں کوئی بھی نظام ہو اس کی روح انسانی اور روحانی قدروں سے ہی توانا اور تنومند رہتی ہے اور ان کے بغیر مردہ۔ تم میرا یہ خیال اپنے بڑے وزیر پر ظاہر کر سکتے ہو۔

منسٹر۔ کاش آپ پھر زندہ ہو کر یہ بات کہتے ؟

مہاتما۔ سچ بات کہنے کے لئے زندہ ہونے کی ضرورت نہیں۔ سچ بات سچ ہی ہوتی ہے خواہ وہ ایک مجسمے کی زبان سے ادا ہو ؎

مرد باید کہ گیرد اندر گوش
ور نوشتست پند بر دیوار

منسٹر۔ (کلائی کی گھڑی پر نظر ڈالتے ہوئے) مہاتما! معاف کیجئے اب اسمبلی کا وقت ہو گیا ہے مجھے اجازت دیجئے میں بڑے وزیر کو آپکے خیالات سنا دوں گا۔

مہاتما۔ مجھے جو کہنا تھا کہہ چکا۔

منسٹر موٹر میں داخل ہو گیا اور موٹر اسٹارٹ ہو کر روانہ ہو گئی۔
مہاتما کا چہرہ جو منسٹر سے بات کرتے وقت نیچے کی طرف جھکا ہوا تھا پہلے کی طرح سیدھا ہو کر ساکت و خاموش ہو گیا۔

فقیر شاہ

فقیر شاہ ایک ادھیڑ عمر کے آدمی تھے، میانہ قد، چوڑا چہرہ، ہلکا سانولا رنگ، بڑی بڑی آنکھیں، منھ پر جھرّیاں، ریش و بروت صاف ہونے کے باوجود بال زیادہ ہونے کی وجہ سے رخساروں اور لبوں پر اودھے رنگ کے نشان تھے۔ یہ گجرات کے رہنے والے ایک خوش حال گھرانے کے فرد تھے لڑکپن اور جوانی ماں باپ کے گھر میں بھائی بہنوں کے ساتھ ہنستے کھیلتے گذر رہی تھی۔ دس بارہ سال ہوئے ان کے ماں باپ ایک آدھ سال کے وقفے سے اولاد کو داغِ مفارقت دے گئے تھے اور ان سے جو متروکہ ان کے حصّے میں آیا تھا اس کو فقیر شاہ عیش و نشاط اور شراب و کباب کی داد دے کر تقریباً اڑا چکے تھے۔ اب جو فکر روزگار نے پریشان کیا تو وطن سے نکل کر بمبئی پہونچے، وہاں ایک آدھ سال قسمت آزمائی کی لیکن کچھ پیش نہ گئی۔ بالآخر مایوس ہو کر حیدرآباد آئے اور یہاں بھی دو ایک کاروبار میں ہاتھ ڈالا لیکن کامیابی نہیں ہوئی تو ایک مشہور بیمہ کمپنی کی ایجنسی لے لی۔ یہاں دوست احباب کی

مدد سے جنھوں نے سرکاری محکموں کے اندر اور باہر بیمہ کرانے والے خواہشمندوں سے ان کا تعارف کرا دیا تھا، ان کا کاروبار چل نکلا، اور چند ہی سال میں بیمہ کے کمیشن کی آمدنی سے ان کو ماہانہ دو ڈھائی سو روپے ملنے لگے۔

لیکن اس آمدنی کے ساتھ پھر دختر رز نے ان کو صلائے آشنائی دی۔ یہ چونکہ ایک زمانے تک اس سے مانوس تھے انھوں نے اس کی آواز پر لبیک کہا اور پھر اس کم بخت کو منھ لگایا، ان کی متوسط آمدنی کا ایک حصہ دختر رز کی نذر ہونے لگا۔ ہلکے قسم کے سگریٹ بھی روزانہ (۲۵-۳۰) سے کم نہ پیتے تھے اس طرح ان کی ماہانہ آمدنی کی ایک تہائی شراب اور سگریٹ کے نذر ہو جاتی تھی۔

یہ حیدرآباد آنے کے بعد ایک کم کرایہ کے سرکاری مکان میں رہتے تھے جس کے صرف دو کمرے اور ایک دالان اور ایک چھوٹا سا حمام اور باورچی خانہ تھا، ان کے ساتھ ان کی ایک لڑکی رہتی تھی جس کی عمر (۲۱، ۲۲) برس کے لگ بھگ ہوگی۔ ان کی بیوی چار پانچ سال ہوئے مرض دق سے مر چکی تھی۔

میری ان کی ملاقات پونہ کے ایک کالج میں ہوئی تھی جہاں وہ مجھ سے دو سال سینیر تھے وہ مجھے شروع میں ہی ایک خوش حال گھرانے کے

قسم کے لیکن پُرخلوص آدمی معلوم ہوئے اور چونکہ اس زمانے میں انکے والدین بقید حیات تھے ان کو کالج کے خرچہ کا توڑا بھی نہیں تھا اور ہم یہ محسوس کرتے تھے کہ وہ ایک شاہ خرچ قسم کے آدمی ہیں۔ غالباً اسی زمانے سے وہ دخترِ رز کی صحبتوں میں چپکے چپکے شریک ہونے کے عادی ہوگئے تھے وہ پڑھنے میں بھی ماشاءاللہ ذہین تھے اور اگر تفریح و تفنّن اور شوق ذوق کے کاروبار نے ان کے دامن کو نہ چھوا ہوتا تو نہ جانے کیا کچھ جوہر کامل بن کر چمکتے۔ لیکن صرف بی۔اے آنرس کی ڈگری حاصل کر کے تعلیم ختم کر دی جس کے بعد کالج کو خیرباد کہہ کر اپنے وطن چلے گئے۔

ان سے میری ملاقات حیدرآباد میں تقریباً پندرہ سولہ سال بعد ہوئی تھی۔ کالج چھوڑنے کے بعد مجھے کچھ خبر نہ ہوئی کہ وہ کہاں کہاں رہے اور کیا کیا کیا۔ وہ بھی میرے حال سے اسی قدر لاعلم اور بے خبر رہے۔ جب اتنے عرصے کے بعد ان سے میری دوبارہ ملاقات ہوئی تو میں نے دیکھا کہ ان کی شکل و صورت کچھ بھدّی سی ہوگئی تھی اور منہ پر جھرّیاں پڑ گئی تھیں جو کچھ تو کثرتِ مے نوشی اور کچھ گردشِ روزگار اور غمِ دوراں کا اثر تھا۔ ایک دفعہ متروکہ تقسیم ہو جانے کے بعد ان کے بھائیوں نے بھی ان کی طرف سے منہ پھیر لیا اور ان کی کچھ مدد نہ کی۔ بہرحال جب اس مدت دراز کے بعد مجھ سے ملے تو اسی تپاک اور

خلوص سے ملے جو کسی زمانے میں تھا۔

فقیر شاہ جب یہاں پہونچے تو چند روز کے بعد مجھ سے ملنے کے لئے میرے گھر آئے اور بہت گرمجوشی سے ملے۔

"اوہو خورشید! کتنے برسوں کے بعد ہم ملے، کیسے ہو، اچھے ہو نا۔"

میں نے کسی قدر بے تکے پن سے کہا "اوہو، فقیر شاہ! تم کتنے بدل گئے ہو، میں نے تمہیں مشکل سے پہچانا، ابھی سے کتنے بوڑھے ہو گئے!"

یہ فقرہ میں نے بالکل سادگی سے کہا تھا لیکن میں نے یہ محسوس کیا کہ فقیر شاہ پر اس فقرہ کا کچھ اثر ہوا، جیسے میں نے کہا ہو کہ "فقیر شاہ تم نے اپنی صحت کیسے برباد کر لی اور شکل و صورت کے ساتھ یہ کیا ستم کیا! دیکھو میں کیسا تازہ توانا ہوں" غالباً اسی قسم کے سیدھے سادھے فقرے انکے دوست احباب نے بھی ان سے ملاقات کے وقت کہے ہوں گے جن کا نفسیاتی اثر ان پر الٹا ہوا۔ اس فقرے سے غالباً وہ یہ بھی سمجھے ہوں گے کہ میں نے ان کی گذشتہ بے راہ روی اور آوارہ مشربی پر فقرہ کسا ہے۔

بہر حال اس کے قطع نظر وہ اور میں مسکراتے اور ہنستے بولتے رہے اور بہت دیر تک پرانے زمانے اور کالج کی زندگی کے واقعات کی یاد تازہ کرتے رہے۔ دوران گفتگو میں ایک دن انھوں نے پوچھا:

"خورشید، بچے کتنے ہیں؟"

میں نے مسکراتے ہوئے کہا: "میں ابھی کنوارا ہی ہوں۔"

"کیوں، کیوں؟"

"بعض وجوہ سے میں نے شادی نہیں کی۔"

تھوڑی دیر اِدھر اُدھر کی باتیں کر کے رخصت ہوتے وقت انھوں نے کہا:

"خورشید کسی روز میرے ساتھ کھانا کھاؤ! تفصیل سے باتیں کریں گے میں تو اب یہیں رہوں گا۔ اس عمر میں نوکری تو ملتی نہیں کہیں کچھ دھندا کرنے کا خیال ہے۔"

"کیوں اب وطن نہیں جاؤ گے؟"

"وطن میں کیا رکھا ہے! ماں باپ مر گئے، بیوی مر گئی، بھائی بہن اپنے اپنے کاروبار میں لگے ہوئے ہیں (انھوں نے اپنے نجی تعلقات کو مخفی رکھنا ہی مناسب سمجھا اور طنز سے مسکراتے ہوئے کہا) حضرت مسیح کا قول تو تم کو معلوم ہوگا: پیغمبر کی قدر خود اس کے وطن میں نہیں ہوتی۔

"اوہو! تمہارا مطلب میں سمجھ گیا۔" میں نے بھی مسکراتے ہوئے کہا خیر کسی روز فرصت سے مل کر بیٹھیں گے اور خوب گپ شپ ہوگی میں تمہارے پاس چلا آؤں گا یا تم کسی روز میرے پاس کھانے کو چلے آنا۔"

اس ملاقات کو بھی دو ایک برس ہو گئے۔ اس اثنا میں کبھی کبھی

کہیں کہیں ہماری ملاقات ہو جاتی تھی لیکن یہ محض سرسری ملاقات ہوتی تھی تفصیل سے میں نے یہ معلوم کرنے کی کوشش نہیں کی کہ انھوں نے کیا پیشہ اختیار کیا تھا۔ البتہ ایک روز جب راستہ میں ان سے ملاقات ہوئی تو انھوں نے کہا کہ وہ ایک کمپنی میں جان کے بیمے کی ایجنسی کا کاروبار کر رہے ہیں۔ ایک دفعہ وہ میرے گھر آئے اور تفصیل سے بیمہ کے فوائد بیان کر کے میری جان کے بیمے کی ایک پالسی حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ ہر چند میں کہتا رہا کہ میں اس کے پہلے دو پالسیاں ایک دوسری کمپنی میں لے چکا ہوں اور اب میری گرہ میں مال نہیں ہے مگر وہ نہ مانے اور میری جان کے لاگو ہو گئے۔ ایں ہم اندر عاشقی بالائے غم ہائے دگر۔

ان کو دمے کی شکایت تھی جو رفتہ رفتہ زیادہ تکلیف دہ ہو گئی یہ شکایت ان کی کاروباری ملاقاتوں میں حایل ہونے لگی، اس کے باوجود یہ دکھ اور تکلیف اٹھاتے رکشا میں گھومتے ہوئے اپنے کاروبار کی تکمیل کرتے رہتے تھے، دوسری فکر ان کو اپنی جوان بیٹی کی تھی جو ماشاءاللہ شادی کے قابل ہو گئی تھی۔ ان کے پاس اتنا پیسہ کہاں تھا کہ لڑکی کے لئے کوئی بَر ملتا اور پیام وسلام ہوتا۔ مشکل سے انھوں نے لڑکی کے نام دو ہزار روپے بنک میں پس انداز کئے تھے اور اس میں سے بھی مجبوراً کسی نہ کسی ضرورت سے کبھی کبھی کچھ رقم نکال لیتے اور چونکہ یہ رقم لڑکی کے بیاہ کیلئے

محفوظ کی تھی، پیسے ہاتھ میں آنے پر اس کی تکمیل کر دیتے تھے لیکن وقت گذرتا گیا اور لڑکی کے لئے کسی طرف سے سلسلہ جنبانی نہیں ہوئی اور نہ ان کی پریشانی بڑھتی گئی۔ اس پریشانی میں غم غلط کرنے کے لئے انھوں نے شراب کی مقدار بھی بڑھادی اور سگریٹ کی تعداد بھی۔ چنانچہ کچھ دمّے کی تکلیف اور کچھ پریشانی سے نجات حاصل کرنے کے لئے وہ دن میں بھی شراب پینے لگے تھے، وہ خوددار بھی بہت تھے کبھی کسی سے اپنی پریشانی کا اظہار کرکے دوسروں کے سامنے دستِ امداد دراز کرنا انھیں نہیں آتا تھا، جب کبھی مجھ سے ملتے مسکراتے ہوئے اِدھر اُدھر کی باتیں کرکے رخصت ہوجاتے اور اپنی پریشانی اور تکلیف کا ایک حرف بھی زبان پر نہیں لاتے۔

ایک دفعہ جب وہ ملے تو میں نے ان کو کھانے پر مدعو کیا۔

"فقیر شاہ، پرسوں رات کو میرے ساتھ کھانا کھانا! میں نے دوچار دوستوں کو بھی کھانے کے لئے بلایا ہے۔"

فقیر شاہ نے دعوت قبول کرتے ہوئے مسکرا کر کہا "ضرور! مگر کیا لال پری کی بھی دعوت ہے، یا میں اس کو اپنے ساتھ لاؤں یا یہ کہ میں اس سے مل کر تمہارے پاس آؤں۔"

میں اس کا مطلب سمجھ گیا "نہیں، نہیں، تمہاری لال پری بھی

موجود رہے گی، تم اس سے یہیں ملنا۔"

فقیر شاہ اپنے مطلب کی بات پاکر خوش ہو گئے، اور دعوت کا خیال دماغ میں پکانے لگے، وہ کھانے کے زیادہ شوقین نہیں تھے، یہ کم بخت شراب جس کے منھ کو لگ جاتی ہے وہ اس کو کھانے کا موقع ہی کب دیتی ہے! وہ محض مے نوشی کی صحبت کے خیال سے ریشہ خطمی ہو رہے تھے۔

مقررہ روز کھانے کے وقت سے ایک گھنٹہ پہلے وہ میرے گھر پہنچ گئے، ابھی دوسرے دعوتی نہیں آئے تھے وہ کچھ بے چین ہو رہے تھے انھوں نے مجھ سے کہا:

"خورشید! تمہارے دوست ابھی نہیں آئے، ان کے آنے سے پہلے ہی اجازت ہو تو شغل لال پری کا شروع کر دوں! تمہارے دوستوں کے سامنے یہ شغل کیوں رہے، کہاں ہے وہ لال پری؟"

میں ان کی بے تابی کو دیکھ کر ان کو ایک بغلی کمرے میں لے گیا، جہاں مے اور آلات مے کشی ایک میز پر رکھے ہوئے تھے، حضرت کرسی پر بیٹھ گئے اور شیشہ کھول کر گلاس میں ایک ڈبل پیگ انڈیلا اور کچھ سوڈا شریک کرکے اپنے ہونٹوں تک لے گئے اور پھر میری طرف گلاس بڑھا کر "چی آرس" کہا اور ایک بڑا گھونٹ حلق میں اتار ا اور سگریٹ جلایا

میں کچھ دیر تک ان سے باتیں کر کے کسی کام سے کمرے کے باہر گیا، تھوڑی دیر میں میرے دوسرے دوست بھی آ گئے میں نے ان کو باہر کی نشست گاہ میں بٹھایا اور ریڈیو چالو کر کے ان سے باتیں کرنے لگا۔

میں جب دوستوں سے تھوڑی دیر باتیں کرنے کے بعد فقیر شاہ کے کمرے میں واپس گیا تو نہ معلوم وہ اتنی دیر میں کتنے پیگ چڑھا چکے تھے اور چہرۂ فروغِ مے سے گلستاں کئے ہوئے بیٹھے تھے۔ سامنے میز پر ایک خاکستردان میں سگریٹوں اور جلی ہوئی کاڑیوں کا انبار لگا ہوا تھا وہ اپنے ہی تلخ قسم کے سگریٹ پی رہے تھے۔

"کھانے کے لئے ابھی آدھ گھنٹہ کی دیر ہے" میں نے کہا۔

"میں ہر وقت تیار ہوں، ورنہ مجھے جلدی نہیں ہے" اس رندِ بلانوش نے کہا۔

یہ کہہ کر فقیر شاہ نے ایک اور پیگ گلاس میں انڈیلا اور تھوڑا سوڈا شریک کر کے ایک لمبا گھونٹ لیا اور جلتا ہوا سگریٹ پھینک کر دوسرا سگریٹ جلایا۔ وہ شراب پی نہیں رہے تھے بلکہ حلق میں انڈیل رہے تھے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ان کو مے سے نشاط نہیں بلکہ بے خودی چاہیئے آنکھیں مخمور ہو گئی تھیں، چہرہ تمتما رہا تھا اور ان کا غم پنہاں خاموشی میں بول رہا تھا وہ کچھ کہنا چاہتے تھے مگر ایسا معلوم ہوتا تھا کہ بات حلق میں اٹک

رہی تھی۔

مزاحاً میں نے کہا "فقیر شاہ، تم اس وقت کہاں ہو؟"

انھوں نے فی الفور جواب دیا "عالم بالا میں، فلک الافلاک پر۔ لیکن خورشید، میں کہیں بھی ہوں روشن کا خیال میرے ساتھ ہے"۔ روشن ان کی بیٹی کا نام تھا۔

میں ان سے اس عالم بالا میں کسی قسم کی سنجیدہ گفتگو کرنا نہیں چاہتا تھا ورنہ مجھے اچھی طرح معلوم تھا کہ اس عالم بے خودی میں بھی ان کو اپنی بیٹی کا خیال تھا، اس کی جلد از جلد کہیں شادی کر دینے کا خیال تھا کہ بیماری اور پریشانیوں کی وجہ سے ان کو زیادہ دن زندہ رہنے کا بھروسہ نہیں تھا۔ مگر شادی ہو تو کیوں کر؟ بر ملے تو کس طرح سے؟ کہ بر لانے والی چیز ہی ان کی گرہ میں نہیں تھی، روشن کو میں نے دیکھا تھا وہ ایک معمولی شکل وصورت کی لڑکی تھی اور زیادہ پڑھی لکھی بھی نہیں تھی، البتہ خانہ داری کے امور میں طاق تھی اور اپنے باپ کا گھر نہایت کفایت شعاری اور سلیقہ سے چلا رہی تھی، باپ کو بیٹی سے اور بیٹی کو باپ سے عشق تھا اور بیٹی اپنے باپ کے غم پنہاں کو خوب سمجھتی تھی اور اس غم کو مٹانے کے لئے ایک بولتی مینا کی طرح ان کو خوش رکھنے کی کوشش کرتی تھی۔

اتنی دیر میں اندر سے کھانے کی گھنٹی بجی، یعنی یہ کہ کھانا میز پر چنا گیا تھا۔ میں فقیر شاہ کو کھانے کے لئے تیار ہو جانے کا نوٹس دیکر باہر کے کمرے میں دوستوں کو بلانے کے لئے گیا اور ان کو لے کر کھانے کے کمرے میں آیا، پھر فقیر شاہ کے پاس جا کر ان کو بلالایا۔ اس اثناد میں فقیر شاہ نے اپنی گلاس خالی کر دی تھی اور ایک اور سگریٹ جلایا تھا۔ کھانے کے کمرے میں میں نے فقیر شاہ کا تعارف اپنے دوستوں سے بہ انداز خاص کرایا اور سب کھانے کی میز کے گرد کرسیوں پر بیٹھ کر ادھر اُدھر کی باتیں کرتے ہوئے کھانے لگے۔

میں نے اپنے دوستوں سے فقیر شاہ کے کالج کے زمانے کے دیرینہ تعلقات کا ذکر کرتے ہوئے ان کے خلوص کو ان کی خود داری اور شرافت نفس کو سراہا اور ان کی ظرافت بیانی کی تعریف کی۔ فقیر شاہ نے بھی کچھ مزے مزے کی باتیں کہیں اور چند لطیفوں اور چٹکلوں سے کھانے کے مزے کو چٹ پٹا بنا دیا جس سے سب لوگ رلشہ خطمی ہو گئے۔ ایسا معلوم ہوا کہ فقیر شاہ جب اس عالم میں آجائیں تو زندی اور لطیفہ گوئی سے غم غلط کرنے کا گر خوب جانتے تھے۔

کھانا ختم کرنے کے بعد سب باہر کے کمرے میں آئے اور سگریٹ جلاکر کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ فقیر شاہ الگ کرسی پر سگریٹ پیتے ہوئے

خاموش بیٹھے رہے۔ کچھ باتیں ہوئیں۔ مجھے معلوم تھا کہ فقیر شاہ کو کچھ اداکاری میں بھی دخل تھا جس نے ان سے خواہش کی کہ وہ اپنا یہ جوہر بھی دکھائیں۔ فقیر شاہ نے پہلے تو کچھ عذر کیا مگر سب کے اصرار پر راضی ہو گئے انھوں نے اندرسبھا امانت کی ناٹک کے چند سین کی اداکاری اس خوبی سے کی کہ لطف آگیا اور محفل میں جان پڑ گئی، ہر ایک کردار کی زبان سے حسب ضرورت آواز بدل بدل کر راجہ اندر کی سبھا میں آمد کے موقع کا سوانگ انھوں نے اس طرح شروع کیا:

"سبھا میں دوستو اندر کی آمد آمد ہے
پری جمالوں کے افسر کی آمد آمد ہے"

اور راجہ اندر کی زبان سے:

"راجہ ہوں میں قوم کا اندر میرا نام ؏ بن پریوں کی دید کے مجھے نہیں آرام"

اور راجہ اندر کے علاوہ پکھراج پری، نیلم پری، لال پری اور سبز پری اور شہزادہ گلفام کا الگ الگ آواز سے اس خوبی سے پارٹ ادا کیا کہ ناٹک کا منظر آنکھوں کے سامنے آگیا۔ سبھوں کو فقیر شاہ ایک چھپے رستم نظر آئے۔ سبھوں نے ان کے لطفِ صحبت کی تعریف کی اور پھر کبھی ایک صحبت جمانے کا وعدہ لے کر رخصت ہوئے۔ فقیر شاہ سواری نہ ہونے سے کچھ دیر ٹھہر گئے اور ملازم کے کھانا کھانے کے بعد رکشا

منگوانے کا انتظار کر رہے تھے۔

میں دوستوں کو رخصت کر کے کمرے میں واپس آیا اور فقیر شاہ کے برابر کی کرسی پر بیٹھ گیا۔ فقیر شاہ اگرچہ کچھ دیر لال پری کے سایہ میں اور میرے دوستوں سے دل لگی مذاق اور اندر سبھا کی اداکاری میں اپنے آپ کو بھلانے کی کوشش کر رہے تھے مگر ان کے تحت الشعور میں ان کی بیٹی روشن کا سایہ منڈلا رہا تھا اور میں اچھی طرح انکے دل کے اس کرب و اضطراب کو محسوس کر رہا تھا۔

میں نے کہا "فقیر شاہ! تم نے آخر روشن کے معاملے میں کیا سوچا ہے؟ مجھے معلوم ہے کہ تم کو اس کی بڑی فکر ہے اور مجھے تمہاری اس فکر کی فکر ہے۔"

جیسے ان کے دل کی بات میری زبان نے کہی، ان کے چہرے کی عارضی چمک غائب ہو گئی جو لال پری کے نشہ اور تھوڑی دیر کے تفنن طبع سے پیدا ہو گئی تھی اور گہری سوچ میں پڑ گئے۔ انکے دل میں جذبات نے وہ شور اٹھایا کہ ان کی آنکھیں ڈبڈبائی سی نظر آئیں۔ وہ کہتے کیا جب ان کو امید کا کوئی کنارہ اور روشن کا کہیں ٹھکانا نظر نہیں آتا تھا مجھے افسوس ہوا کہ آج شام کی خوش طبعی اور تفریحی محفل کے بعد میں نے ناحق روشن کا ذکر چھیڑ کر فقیر شاہ کے دل پر ایک تیر مارا اور ان کو اس قدر

کبیدہ خاطر بنا دیا جیسے ایک طربیہ کو المیہ میں بدل دیا ہو۔ لیکن آخر یہ المیہ کب تک المیہ بنا رہے اور کس طرح طربیہ میں تبدیل ہو؟

فیقر شاہ گو مجھ سے عمر میں چند سال بڑے اور کالج میں مجھ سے سینیر تھے نگران سے اور ان کی اندازِ طبیعت سے مجھے ایک خاص انس ہو گیا تھا۔ ان کی صدق دلی اور اخلاص اور ان کی سادگی اور غریب الوطنی پر مجھے کچھ ترس سا آتا تھا۔ ان کا دل ایک "طلسم پیچ و تاب" بنا ہوا تھا جس میں روشن کی خوشیاں دیکھنے کی تمنا گرفتار تھی۔ اس "طلسم پیچ و تاب" سے نکلنے کی کیا صورت ہو سکتی ہے؟

انھوں نے بات اڑاتے ہوئے جواب دیا "کچھ نہیں سوچا۔ سوچوں کیا خاک! خورشید، میری کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔"

میں نے پوچھا "پھر کیا روشن کے لئے کہیں سلسلۂ جنبانی کی جائے؟"

"خورشید، میں تم سے کہنا ہی چاہتا تھا مجھے یہ فکر کھا رہی ہے۔"

"روشن کی کیا عمر ہے؟" میں نے پوچھا

"بائیسواں سال ہے، جیسے جیسے عمر زیادہ ہوتی ہے تم کو معلوم ہے شادی میں اور بھی مشکل ہوتی ہے۔ خصوصاً جبکہ پیسہ لتا نہ ہو۔"

"اگر لڑکے کی عمر کچھ زیادہ ہو تو؟" میں نے کہا

"پانچ سات برس کا فرق ہو تو مضائقہ نہیں۔"

"اور اگر دس گیارہ برس کا فرق ہو تو؟"

"دس گیارہ برس کا فرق تو کچھ زیادہ ہو جاتا ہے۔ کیوں، کیا تمہاری نظر میں کوئی ایسا جوان ہے؟"

"میں یوں ہی پوچھ رہا تھا، اگر کم عمر کا کوئی جوان نہ ملے تو کیا کچھ زیادہ عمر کا جوان تم اور روشن پسند کریں گے یا نہیں، اس خیال سے میں پوچھ رہا تھا۔"

"مجبوری کا کیا علاج ہے خورشید! ویسے کہاوت 'ساٹھا پاٹھا' بھی تو مشہور ہے۔ کہتے ہیں مرد ساٹھ برس کی عمر میں بھی جوان پٹھا نظر آتا ہے اور عورت بیس برس میں ہی اتر جاتی ہے۔ خیر، خیر۔ میں اس دنیا سے منہ کالا کرنے سے پہلے کسی صورت روشن کا بوجھ کاندھے سے اتارنا چاہتا ہوں خورشید!"

"فقیر شاہ!" میں نے معنی خیز لہجے میں ان کی طرف دیکھ کر کہا۔

"کیوں کیا ہے؟ کیا کوئی صورت تمہارے ذہن میں آئی ہے؟" فقیر شاہ نے پوچھا۔

"اور اگر تمہاری روشن کا بیاہ مجھ سے ہو جائے تو؟"

"خورشید یہ تم کیا کہہ رہے ہو؟ کیا کہہ رہے ہو خورشید!" فقیر شاہ کی آنکھیں ڈبڈبا ئیں اور وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگے۔

ان کے دل میں ایک ساتھ مختلف جذبات نے جوش مارا، ایک طرف روشن کی کس مپرسی کا خیال اور اپنی بے بضاعتی و تنہائی کا ماتم، دوسری طرف ایک "طلسم پیچ و تاب" سے ان کو نکالنے کے لئے خورشید کی مخلصانہ اور والہانہ کوشش اور ایثار! پھر ان کی اکلوتی بیٹی کے لئے اسقدر اچانک طور پر بر مل جانے کی خوشی! خواہ وہ عمر میں زیادہ سہی، انکے خیال میں عمر کے قطع نظر وہ ایک فرشتہ خصال بر تھا۔ ان کے آنسوؤں میں مسرت اور سوز و گداز کے ملے جلے جذبات کی چمک تھی۔

میں نے روشن سے بیاہ کرنے کا آفر اور خیال کچھ ایسے اچانک اور غیر متوقع طور پر ظاہر کیا تھا کہ فقیر شاہ کی کچھ سمجھ میں نہ آیا۔ ایسا معلوم ہوا کہ اندھیرے میں ایک بجلی ان کی آنکھوں میں چمک کر آگے کا راستہ دکھا گئی۔

میں نے ان کو ٹھنڈا کرنے کے لئے کہا "فقیر شاہ رو کیوں رہے ہو بھئی؟ بس بس آنکھ سے آنسو پونچھو، خوشی کی بات پر رونا کیسا؟"

"ہاں ہاں، خوشی کی بات ہے ...... میں تو ...... میری کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ میں کیوں رو رہا ہوں!"

(مسکرا کر) ہاں ہاں، اب تمہاری سمجھ میں آیا کہ میں نے اب تک شادی کیوں نہیں کی کہ (مسکرا کر) ایک روز خورشید کی زندگی روشن ہو گی۔"

فقیر شاہ نے کچھ روتے اور کچھ مسکراتے ہوئے کہا "خورشید تم ضلع جگت خوب بولتے ہو"

رکشا آگیا تھا کچھ اسی طرح کی مختصر بات چیت کے بعد ہم نے ایک دوسرے کو خدا حافظ کہا اور فقیر شاہ نے بار بار میرا شکریہ ادا کیا، غالباً دعوت کا اور اس سے زیادہ روشن کے بیاہ کے آفر کا۔ اس کے ساتھ وہ رکشا میں سوار ہو کر روانہ ہو گئے۔ رات کے گیارہ بج چکے تھے۔

....

اس دعوت کو اور اس بات چیت کو تقریباً ایک سال کا عرصہ ہو گیا اس اثناء میں دعوت کے روز کی بات چیت کے ایک ماہ کے اندر میرا بیاہ روشن سے سیول میاریج کے طریقے سے ہو گیا تھا۔ فقیر شاہ کے مکان پر ایک چھوٹی سی تقریب ہوئی جس میں دلہا دلہن کے علاوہ فقیر شاہ کے چند دوست احباب اور چند اڑوس پڑوس کے لوگ شریک ہوئے چائے اور کیک بسکٹ، سگریٹ پان سے مہمانوں کی تواضع کیگئی۔ فقیر شاہ خوش خوش مہمانوں میں گشت کر رہے تھے اور اپنے دوستوں سے اور دوست ان سے مذاق دل لگی کر رہے تھے۔

عقد کے ٹھیک دسویں مہینے میں روشن کے بطن سے گھر کا چراغ روشن ہوا یعنی ایک صاحبزادے تشریف لائے۔ زچگی دوا خانے میں

ہوئی۔ کسی نے کہا نومولود باپ کی طرف گیا ہے۔ کسی نے کہا نانا سے مشابہ ہے۔ غرض نانا کو اب اپنے بیمہ کے کاروبار کے علاوہ بچے کے ساتھ کھیلتے رہنے کا نیا مشغلہ ہاتھ آگیا ہے اور وہ جب کبھی گھر میں موجود رہتے ہیں بچہ کے ساتھ آغوش کرتے رہتے ہیں۔ اس کے بعد انھوں نے شراب بھی کم کردی ہے اور سگریٹ بھی۔

افیونی کا خواب

"حضرات! ابھی دس منٹ پہلے مجھ سے یہ خواہش کی گئی ہے کہ اس جلسہ میں جہاں اور اصحاب نے اپنی اپنی زندگی کے اہم تجربات آپ صاحبان کے سامنے بیان کئے ہیں، میں بھی اپنی زندگی کا کوئی دلچسپ تجربہ بیان کر کے آپ کی سمع خراشی کروں۔

"حضرات! اوّل تو یہ کہ میں اس کے لئے بالکل تیار ہو کر نہیں آیا ہوں پھر کسی موضوع پر تقریر کرنے کے لئے پہلے خیالات اور تجربوں کے ہجوم میں ایک ایسے خیال یا تجربے کو ڈھونڈھ نکالنے کی ضرورت ہے جس میں اوروں کے لئے دلچسپی کی چاشنی ہو، اور اس کے ساتھ خوش کلامی اور قصہ گوئی کا نمک مرچ لگا کر اس چاشنی کو اور لطیف و بامزہ بنا یا گیا ہو۔ دوسرے یہ کہ میرے خیال میں ایک شخص کی زندگی کے تجربے دوسرے کے لئے مفید اور دلچسپ نہیں ہوتے۔ تجربہ کا تعلق زندگی سے ہے۔ ہر شخص کا تجربہ اس کی زندگی کی طرح علیحدہ ہوتا ہے اور اسی کے لئے کارآمد اور دلچسپ بھی ہوتا ہے، جس طرح کوئی انسان دوسرے کی زندگی کی

گہرائی میں نہیں جا سکتا، اسی ایک کا تجربہ دوسرے سے میل نہیں کھاتا لیکن یہ بھی صحیح ہے کہ ایک انسان کے تجربے خود اس کے لئے اتنے نہیں جتنے دوسروں کے لئے دلچسپی کا سامان ہوتے ہیں، اور انسان اپنی زندگی یا تجربے کی کمی کو دوسروں کی زندگی اور تجربے سے پورا کرنا چاہتا ہے۔ یہ ایک سماجی شعور یا احساس کی کسک ہوتی ہے۔ بہرحال، حضرات موضوع تقریر کے چننے کے لئے سوچنے اور وقت کی ضرورت ہوتی ہے اور وقت خود زندگی ہے، آپ وقت کو گھڑیوں لمحوں اور سن و سال سے نہ ناپئے یہ دل و دماغ اور ہاتھ پاؤں کی حرکت ہے۔ سوچنے کی تلازمات ہوتے ہیں۔ اس تنگ وقت میں ان تلازمات کی فکر و جستجو مشکل ہے۔ یہ اور بات ہے کہ میں فضول بکواس سے کچھ دیر آپ کی سمع خراشی کرکے آپ کو تختۂ مشق بناؤں جس طرح ہمارے رہنما سیاسی اور سماجی پلیٹ فارم سے کرتے رہتے ہیں۔"

یہ تقریر بے محابا ابوالبیان کی تھی جو وہ پلیٹ فارم پر کھڑے ہوئے ایک جلسہ میں فرما رہے تھے، وہ جلسہ میں تھوڑی دیر ہوئی پہنچے تھے جب کہ کارروائی ختم ہونے کے قریب تھی۔ ان کے قریب چند مُقطّع قسم کے آدمی کرسیوں پر بیٹھے ہوئے تھے ان میں سے کوئی اخبار دیکھ رہا تھا، کوئی اپنا فاؤنٹن پین ہونٹوں کو لگایا ہوا کچھ سوچ رہا

بیٹھا تھا، کوئی پنسل سے کان کرید رہا تھا، اور ایک بزرگ صدرِ جلسہ کی حیثیت سے بیچوں بیچ آنکھ بند کئے ہوئے بیٹھے تھے اور تقریباً چار پانچ سو آدمی جلسہ گاہ میں بیٹھے ہوئے تقریروں کا تختۂ مشق بن رہے تھے جب ابوالبیان نے کچھ نئے انداز میں اپنی تقریر کی تمہید اٹھائی تو سب کے کان ان کی طرف متوجہ ہوئے۔ صدرِ جلسہ نے آنکھیں کھول دیں ان کے بازو کے لوگوں نے بھی جو اخبار یا کاغذات کے مطالعہ میں مصروف تھے، ابوالبیان کی طرف نظریں اٹھائیں، انھوں نے سفینۂ تقریر کو دریائے سماعت میں پھر اس طرح رواں کیا۔

"حضرات! ایک اور وجہ مجھے تقریر کرنے سے مانع آرہی ہے اور وہ آپ کے تھکے تھکے چہرے ہیں جو مسلسل دو تین گھنٹوں کی تقریریں سنتے سنتے تھک سے گئے ہیں، معلوم ہوتا ہے کہ اب آپ کا صبر کا پیمانہ لبریز ہوگیا ہے اور آپ حضرات اپنے اپنے کاروبار کی سوچ میں ہیں جو آپ کو یہاں سے گھر جاکر تکمیل کرنے ہیں، مگر سکریٹری صاحب جلسہ کو اصرار ہے کہ اگرچہ میں اس جلسہ میں دیر سے پہونچا ہوں، تبرکاً چند الفاظ کہوں اگر آپ کی اور صدر صاحب کی اجازت ہو تو کچھ سمع خراشی کردوں!"

صدرِ جلسہ نے حاضرینِ جلسہ پر ایک سرسری نظر دوڑائی اور ایسا محسوس کیا کہ سامعین ابوالبیان کی آخری تقریر بھی سن ہی لیں گے۔

بشرطیکہ طویل اور صبر آزما نہ ہو، غالباً صدر اپنے پیمانے سے سامعین کے صبر کا اندازہ لگا رہے تھے یا یہ کہ وہ صدر کا فریضہ سمجھتے تھے کہ جب ابوالبیان جیسا سحر بیان مقرر پلیٹ فارم پر آئے تو اس کو تقریر کرنے سے محروم نہ کیا جائے خواہ یہ امر سب کے لئے کتنا ہی صبر آزما ہو، بہرحال انھوں نے مقرر سے مخاطب ہو کر کہا:

"آپ اپنی تقریر جاری رکھئے، جناب! لیکن پندرہ بیس منٹ سے زیادہ طویل نہ بنائیے کہ طویل تقریریں سب سن چکے ہیں" یہ کہتے ہوئے صدر مسکرائے اور ابوالبیان نے اجازت پاکر سلسلۂ تقریر کو یوں جنبش دی:

"حضرات! یوں تو میری زندگی میں بہت سارے دلچسپ اور غیر دلچسپ تجربے ہوئے ہیں، غیر دلچسپ تجربے بھی میرے لئے کسی نہ کسی طرح دلچسپ ہی تھے جو یقیناً آپ کے لئے دلچسپ نہیں ہوں گے لیکن اپنا ایک تجربہ آپ سے عرض کروں گا جو شاید آپ کی دلچسپی کا باعث ہو۔"

صدر ۔ "ہاں ہاں، سنائیے! غیر دلچسپ بھی دلچسپ ہو تو مضائقہ نہیں لیکن وقت کا خیال رکھئے۔"

"حضرات! ایک زمانے میں جس کو آج چار پانچ برس کا زمانہ ہوتا ہے، میں سخت بیمار ہو گیا تھا، ہر قسم کا ڈاکٹری، یونانی اور ایورویدک

علاج کیا، لیکن مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی۔ جسمانی مرض کے علاوہ مالی مشکلات اور روحانی آلام نے بھی میری تکالیف اور مصائب کو دو آتشہ بنا دیا اور میں نے بیماری اور پریشانی کا غم غلط کرنے کے لئے شراب کا سہارا ڈھونڈھا، لیکن فائدہ اور سکون کی صورت نظر نہ آئی۔ بالآخر جب میں نے دوا اور علاج کی شدت میں کمی کر دی، اور مرض کو اپنے حال پر چھوڑ دیا تو میرے مزاج میں بتدریج اصلاح ہونے لگی۔ اس حالت میں بھی ایک عرصے تک بیماری کا سلسلہ جاری رہا۔ اس نوبت پر ایک نیم حکیم نے مجھے بالاصرار یہ مشورہ دیا کہ اگر خفیف مقدار میں افیون کا استعمال کیا جائے تو مرض کو فائدہ ہوگا اور شراب کی عادت بھی چھوٹ جائے گی۔ جب فنِ طب کے نسخوں اور علاج نے ایک طویل عرصے تک میری صحت اور عادات کی اصلاح میں میری مدد نہ کی تو میں نے اس مشورے پر عمل کر کے افیون کا استعمال اس طرح شروع کیا کہ پہلے پہلے مزاج کو عادی بنانے کے لئے میں سوئی کی نوک پر افیون لے کر دو ایک مرتبہ زبان سے چکھ لیتا تھا۔ (سامعین کے لبوں پر مسکراہٹ) اس طرح ایک آدھ مہینے تک عادی ہونے کے بعد میں نے مقدار میں اضافہ کر کے مونگ کے دانے کے برابر گولیاں بنائیں اور پہلے پہلے ایک اور اسکے

بعد دو گولیاں استعمال کرنے لگا، اس کا ایک فائدہ یہ ہوا کہ مرض کا آہستہ آہستہ ازالہ ہوتا گیا اور دوسرا یہ کہ ہلکا ہلکا سرور طبیعت میں آنے لگا۔ جس سے مزاج میں ہلکی تبدیلی محسوس ہونے لگی، میری بدحالی اور بدمزاجی بے خیالی اور بے نیازی میں تبدیل ہونے لگی۔ اور آلام و افکار دنیوی سے بھی کچھ سکون محسوس ہونے لگا۔ اس طرح چُنیا بیگم کے عشق میں میں نے مرض اور رنج والم دونوں سے ایک ساتھ پیچھا چھڑایا اور میرا طائر خیال فلک ہفتم کی بلندیوں پر پرواز کرنے لگا کہ طائر تخئیل کی بلند پروازی کے لیے افیون کے بغیر کوئی نسخہ نہیں (سامعین کی مسکراہٹ) میرے خیال میں نوع انسان کی ترقی کے لئے قوت ارادی سے زیادہ قوت تخئیل کی ضرورت ہے"۔

حاضرین جلسہ اس تقریر کو کچھ حیرت اور مسکراہٹ سے سن رہے تھے۔ حیرت اس بات پر کہ جہاں ابو البیان کی طویل بیماری کو طب کے کسی نسخے سے فائدہ نہیں ہوا تھا وہاں افیون نے کیمیا کا کام کیا۔ مسکراہٹ اس بات پر کہ حضرت بیماری کے طویل راستے سے گذر کر افیون کے بال و پر سے آسمان کی سیر کرنے لگے تھے اور نہایت بیباکی سے بھرے جلسہ میں اس کا اظہار بھی کر رہے تھے۔ ابو البیان نے سامعین کی حیرت اور مسکراہٹ کو محسوس کر کے سمند تقریر کی باگ

اس طرح موڑی:

"حضرات! آپ کو حیرت اس بات پر ہو گی کہ جہاں دوائیں
میری طویل بیماری کو اچھا نہ کر سکیں وہاں افیون نے یہ کام کس طرح کیا۔
اسکی توضیح اسی نیم حکیم نے جس نے مجھے افیون کے استعمال کا مشورہ دیا تھا
یہ کی تھی کہ افیون کی خشکی جسم اور عضلات کی رطوبتوں اور کثافتوں کو
اُسی طرح خشک کر دیتی ہے جس طرح تمازت آفتاب گندگی اور گیلی
مٹی کو سکھا دیتی ہے جس کی وجہ سے افیون کھانے والے کی عمر بھی دراز
ہوتی ہے۔ بہرحال حضرات! بیماری کو رخصت کر کے میں نے چنبیا بیگم
کے آغوش میں جگہ پائی۔ (حاضرین کے ہونٹوں پر مسکراہٹ) اور
روزانہ استعمال میں گولیوں کی جسامت بھی کسی قدر بڑھا دی۔
اور افیون کے مضر اثرات کی اصلاح کے لئے شیرینی کا باقاعدہ استعمال
بھی شروع کر دیا۔ ایک روز نہ جانے اسکے مسلسل استعمال سے یا کچھ
طبیعت کی کمزوری کی وجہ سے مجھ پر افیون کے نشہ کا کچھ ایسا غلبہ
ہوا کہ میں اشتا غفیل ہو گیا، کیا دیکھتا ہوں کہ جہاں تک نظر جاتی
ہے ایک ہرا بھرا میدان ہے جس میں ایک طرف سیب، سنترے
اور ناشپاتی کے اور دوسری طرف آم اور امرود کے سینکڑوں درخت
اور ہزاروں انگور کی بیلیں ہیں جن میں سنہرے اور زرد پیلے رنگ کے

پھل دیکھنے والوں کو دعوتِ "کُلُو" دے رہے تھے اور ایک طرف چنبیلی، موتیا، سیوتی اور گلاب کے تختے اور مہندی اور کیوڑے کے بن مشامِ جاں کو معطر بنا رہے ہیں۔ بادِ لطیف اور آبِ شیریں کی فراوانی ہے، اور لوگ صاف اور شفاف نہروں سے شربت کا سا پانی پی رہے ہیں ایک اور جانب دھان اور گیہوں کے ہرے ہرے کھیتوں میں بلند و بالا شکیل و جمیل مرد اور عورت دہقانی گیت گاتے ہوئے نئے قسم کے آلات اور مشینوں سے کام کر رہے ہیں، اسی خطہ میں ایک طرف فیاکٹریاں اور کارخانے چل رہے ہیں جن میں انسان کی ضروریات خور و خواب، لباس پوشاک، رہن سہن، سکھ اور آرام کے سامان اور امراض اور آلام کے دفع کرنے کی دوائیں تیار ہو رہی ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ یہاں بھوک پیاس بیماری کے مسائل حل ہو گئے ہیں، ایک اور جانب کیا دیکھتا ہوں کہ بڑی بڑی تجربہ گاہیں قائم ہیں جن میں فطری طاقتوں اور ان کے قوانین کو بے نقاب کرنے، انسانی دل و دماغ اور اعضاء و جوارح کو بدلنے، چاند، زہرہ اور مریخ اور نہ جانے کن کن سیاروں کی گردنوں میں کمندیں ڈالنے اور علم انسانی کے حدود کو آگے بڑھانے کے تجربے کئے جا رہے ہیں، ایک طرف بستی کے بے در و دیوار مکانات ہیں جن میں ایک خاندان کو دوسرے خاندان سے جدا کرنے والی حرص،

و لالچ، خود غرضی اور تنگ نظری کی دیواریں حائل نہیں ہیں جہاں رہنے والوں کی آنکھوں میں خلوص اور پیار چمک رہا ہے، جہاں غربت وافلاس، بے کسی و بے لبسی، غرور و نفرت، امتیاز و افتراق کے پردے پڑے ہوئے اور مکر و فریب کے پھندے بچھے ہوئے نہیں ہیں، جہاں ہر شخص علم و فن اور حسن و جمال کی تخلیق و ایجاد کے لئے حسب مقدور کوشاں ہے، جہاں لوگوں کے حقوق دولت و عشرت کی غیر مساوی تقسیم سے پامال نہیں ہو رہے ہیں، جہاں لوگ سیاست و قانون، گراں بار محاصل اور قومی ہیکل اسٹیٹ کے شکنجے میں جکڑے ہوئے فریاد نہیں کر رہے ہیں اور جہاں حاکم اور محکوم کی تفریق اٹھ گئی ہے، جہاں حکومت کی جبریہ تنظیم کی بجائے لوگ مقامی اور پیشہ اور حرفہ کی تنظیموں میں مل جل کر اپنے اپنے مقامی اور حرفتی و صنعتی انتظامات اور کاروبار میں مصروف ہیں ...... میں دل میں سوچ رہا تھا کہ کاش یہ منظر حقیقت بن جائے اور انسان جلال و جمال کی ہم آہنگی سے ایک ایسی ہی دنیا بنائے جس کا نقشہ اس وقت میری آنکھوں کے سامنے ہے ......"

مقرر اپنی اس بے پناہ تقریر کی رو میں بہا جا رہا تھا کہ سامعین میں سے کسی نے اپنی جگہ سے اٹھ کر اس کو اس طرح ٹوکا:

"حضرت! میں یہ معلوم کرنا چاہتا ہوں کہ آیا آپ کی افیون سچ مچ

افیون تھی یا ہمارے شاعروں کی محبوب شراب جیسی چیز جس کو منہ لگائے بغیر یہ شاعر کیف و سرور کے متوالے ہو جاتے ہیں؟"

مُقرّر نے اس سوال کو سُنا اَن سُنا کر کے اس کا جواب دئے بغیر اپنی تقریر جاری رکھی۔

"حضرات! یہ مناظر جو میں نے دیکھے، افسوس وہ ایک افیونی کا خواب تھا جو شرمندہ تعبیر نہیں ہوتا۔ یہ ایک خیالی دنیا تھی جس کو دیکھنے کیلئے بصیرت کی آنکھ اور تخیّل کی افیون درکار ہوتی ہے، میں یہ سوچتا ہوں کہ کبھی وہ دن بھی آئے گا جب یہ خواب حقیقت بن جائے گا اور انسانی دنیا اس خواب کی طرح حقیقی دنیا ہو جائے گی، خواب حقیقت بنے یا نہ بنے انسانی دماغ اس طرح کے خواب دیکھتا رہا ہے اور دیکھتا رہے گا۔"

مُقرّر تقریر ختم کر کے اپنی کرسی پر بیٹھ گئے، پلیٹ فارم پر صدر اور جلسہ گاہ میں حاضرین جلسہ جو ان کی تقریر کو غور اور توجہ سے سُن رہے تھے تقریر ختم ہونے پر اپنے اپنے دلوں میں ایک خوش آئند خواب کی سی لذت محسوس کر رہے تھے۔ اور یہ سوچ رہے تھے کہ ابوالبیان نے جس تفصیل اور خوبی سے افیون کا ذکر کیا ہے کیا وہ سچ مچ افیون تھی یا مجاز و استعارہ۔

آخر میں صدر نے جلسہ کی کارروائی اور مقررین کی تقریروں پر مختصر سا تبصرہ کیا، ابو البیان کی تقریر کے بارے میں انھوں نے کہا کہ یہ ایک دل و دماغ کو جگا دینے والا خواب تھا جس کو ہر افیونی نہیں دیکھتا اور یہ کہ مقرر نے اس خوبی سے خواب کو بیان کیا ہے کہ یہ معلوم نہیں ہوتا کہ یہ بیداری کا خواب تھا یا خواب میں بیداری!
رہی افیون، سو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ زیب داستان کے لئے یہ خوب چیز تھی، اس لطیف تبصرہ نے حاضرین کو محظوظ کیا۔

صدر جلسہ کی اختتامی تقریر اور معتمد جلسہ کے شکریہ کے بعد یہ جلسہ برخاست ہوا اور لوگ اٹھ اٹھ کر اپنے اپنے گھروں کو جانے لگے۔

———(ختم)———

یادگار

وجاہت مرزا اور نورالدین کے مکان ایک ہی سڑک پر آزو بازو واقع تھے اور ان دونوں کے مکان کے درمیان کچھ زمین تھی جس کے بارے میں دونوں میں ایک عرصے سے جھگڑا چلا آرہا تھا۔ وجاہت مرزا کا دعویٰ تھا کہ ان کی زمین کے مشرقی گوشے سے دس درجے کا زاویہ قائم کر کے مشرق سے مغرب جانب ایک خط کھینچا جائے تو جتنی زمین وجاہت مرزا کے مکان کی جانب ہوگی وہ ان کی ملکیت ہے اس کے برخلاف نورالدین کہتے تھے کہ دس درجے نہیں سات درجے کا زاویہ قائم کر کے خط کھینچنے سے جس قدر زمین کا رقبہ ہوگا وہ وجاہت مرزا کا ہے اور اس خط کے دوسرے طرف کی زمین خود ان کی ہے۔ یہ نزاع تقریباً دو سال پرانی تھی، جس کی وجہ سے دونوں مکانوں کے درمیان کی حدِ فاصل کی دیوار تعمیر نہ ہو سکی تھی، اینٹ اور چونا پڑا پڑا سڑ رہا اور خراب ہو رہا تھا۔

اس جھگڑے کی وجہ سے دونوں گھر والوں کے دیرینہ تعلقات

خراب ہو گئے تھے یا کبھی یہ حال تھا کہ وجاہت مرزا کے گھر میں کسی کے سر میں درد ہو جاتا تو نورالدین یا ان کے گھر والے دو چار دوائیں لیکر وہاں پہونچ جاتے۔ یا اب یہ حال ہو گیا کہ نورالدین کو ڈبل نمونیا ہو کر ان کی حالت خراب ہو گئی تو بھی وجاہت مرزا کے گھر سے کسی نے جا کر جھوٹے منھ مزاج پرسی تک نہ کی۔ دوسری طرف ایک دفعہ وجاہت مرزا کی ٹانگ کی ہڈی موز کے چھلکے پر سے پاؤں پھسل جانے کی وجہ سے ٹوٹ گئی اور ڈاکٹر اور جراح علاج کے لئے اور محلہ کے سارے جان پہچان کے لوگ مزاج پرسی کے لئے آئے مگر نورالدین کے گھر سے کسی نے اس طرف پلٹ کر تک نہیں دیکھا۔ غرض یہ کہ اس جھگڑے کے باعث دونوں کے تعلقات بہت تلخ اور کشیدہ ہو گئے تھے اور سارے محلہ اور دونوں کے خاندان کے لوگوں میں ہر دو کی رسوائی کے چرچے تھے۔

اس نزاع کے تصفیے کی کوئی صورت نظر نہ آتی تھی، دونوں فریق اپنی اپنی تائید میں قبالے، نقشے اور دستاویزیں اپنے اپنے دوست شناساؤں کو دکھاتے پھرتے تھے اور دونوں اپنے خلافِ مطلب دستاویزوں کی تردید کرتے تھے، آخر تنگ آکر وجاہت مرزا نے اپنا دعویٰ عدالت دیوانی سے رجوع کر دیا، مقدمے کا دوران بڑھ رہا تھا مگر تصفیے کی کوئی صورت نظر نہ آتی تھی، اور پھر ایک عدالت کے تصفیے کے خلاف دوسرے فریق کو

مرافعہ کا چارہ کار حاصل تھا، اس طرح مرافعہ در مرافعہ کے تصفیے تک نہ جانے کتنے سال درکار تھے۔

وجاہت مرزا اپنی شکستہ ہڈی کے علاج کے لئے دواخانے میں دو مہینے تک رہنے کے بعد گھر واپس آ گئے تھے اور اگرچہ اٹھ بیٹھ سکتے تھے ابھی چلنے پھرنے کی اجازت نہ تھی، ان کی عمر (۵۵، ۶۰) سال کے لگ بھگ ہو گی ایک روز وہ پلنگ پر لیٹے ہوئے اپنی بیوی سے یوں ہم کلام ہوئے:

"دیکھو بیگم! یہ زمین کا تصفیہ میری زندگی میں طے ہوتا نظر نہیں آتا۔ اس نورالدین نے نہ جانے میرے ساتھ کہاں کی دشمنی نکالی ہے، میں اپنی زمین کے سو گز مفت میں کیوں اس کے حوالے کردوں، اور اگر وہ قیمت دیکر بھی لینا چاہے تو میں اس کو نہیں دے سکتا کہ اس سے میری زمین کا آنگن ٹیڑھا ہو کر بدنما ہو جائے گا۔ اتنی بات اس شریر کی سمجھ میں نہیں آتی وہ تو خاصی شرارت پر اتر آیا ہے میں بھی اس کو اس شرارت کا مزہ چکھاؤں گا۔"

وجاہت مرزا کی بیگم صلح جو قسم کی عورت تھی، وہ اس جھگڑے کو طول دینے اور طرفین کے تعلقات، گھر کی فضاء اور گھر والوں کی صحت خراب ہونے کی بجائے دل سے یہ چاہتی تھی کہ کسی طرح دونوں میں سمجھوتہ ہو جائے اور اس سمجھوتے کی وجہ سے مکان کا آنگن کچھ ٹیڑھا بھی ہو جائے تو مضائقہ

نہیں لیکن اس کے شوہر کی تند مزاجی اور اس جھگڑے کی نزاکت کا
خیال کرکے وہ ایک ٹھنڈی سانس بھرتے ہوئے اتنا کہہ کر رہ گئی :
"نہ جانے اس جھگڑے کا تصفیہ کب اور کس طرح ہوگا! اس سے
ہماری زندگی اجیرن ہوگئی ہے۔"

اُدھر نورالدین بھی اس معاملے میں اٹل تھے وہ کسی قیمت پر وجاہت مرزا
سے سمجھوتہ اور صلح کی بات کرنے کے لئے تیار نہیں تھے، ایک دفعہ انھوں نے
اپنے ایک دوست سے جنھوں نے ان کو مفاہمت کا مشورہ دیا تھا غصہ
میں کہا :

"سمجھوتہ کی بات میں کروں؟ وہ تو وجاہت مرزا کو کرنی چاہیئے،
انھوں نے مقدمہ دائر کرکے سمجھ لیا ہے کہ جیت لیں گے بچہ جی۔ ضرورت
ہوئی تو میں اس کو سپریم کورٹ تک لے جاؤں گا۔"

یہ ستر فٹ گز زمین کے لئے سپریم کورٹ تک کی مقدمہ بازی! دونوں طرف
ضد آگئی تھی ورنہ وجاہت مرزا اور نورالدین ایک وقت گہرے دوست تھے۔
وجاہت مرزا کے دو لڑکے اور تین لڑکیاں تھیں، دو لڑکیوں کی شادی
ہوچکی تھی اور لڑکے کالج میں بی۔ ایس۔ سی کی آخری جماعت میں پڑھ رہے
تھے، نورالدین کے تین لڑکے تھے اور ایک لڑکی تھی، ان دونوں گھروں کے
لڑکے لڑکیاں بچپن سے ایک ساتھ کھیلتے کودتے پڑھتے لکھتے تھے اور

آپس میں پیار اور محبت سے رہتے تھے۔ یہ اس زمانے کی بات ہے جب طرفین کے والدین کے تعلقات زمین کے جھگڑے کی وجہ سے خراب نہیں ہوئے تھے بلکہ ان میں باہم شیر و شکر کا تعلق تھا۔

جب سے یہ تعلقات خراب ہونے لگے ان ہر دو گھروں کے لڑکوں لڑکیوں کا آنا جانا اور میل جول کم ہوتے ہوتے بند ہوگیا۔ ان لڑکوں اور لڑکیوں نے خود میل جول بند نہیں کیا بلکہ بند کرادیا گیا تھا۔ اس کے باوجود یہ لڑکے اور لڑکیاں چھپے چھپے کبھی کبھی ایک دوسرے سے سرسری طور پر ایک آدھ بات کرلیا کرتے تھے۔ نورالدین کی لڑکی خدیجہ جس کی عمر ۱۷، ۱۸ سال تھی اور وجاہت مرزا کا چھوٹا لڑکا تمر مرزا جس کی عمر ۲۲ سال تھی آپس میں بہت دوست تھے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ یہ دونوں مکتب علم کے ساتھ ساتھ مکتب عشق و محبت کا بھی چپکے چپکے درس لے رہے تھے ان کے والدین کی باہمی نزاع کے باعث باہمی میل جول پر پابندی خصوصاً ان دونوں کے لئے بہت شاق تھی لیکن چونکہ گھر بازو بازو تھے ان دونوں کی چوری چھپی ملاقاتوں کا دروازہ بند نہیں ہوا تھا اور نہ انکی بے تکلف ملاقاتوں اور ایک دوسرے پر شوخی و ظرافت کی چوٹوں میں فرق آیا تھا ان کو اپنے والدین کے جھگڑے کی اہمیت کا احساس نہیں تھا یا کم از کم وہ یہ سمجھتے تھے کہ یہ جھگڑا انکے دوستانہ تعلقات میں مزاحم نہیں ہوسکتا۔

ایک طرف ان کے ماں باپ کے نہ ختم ہونے والے جھگڑے کا المیہ اور دوسری طرف ان ہی کی اولاد کے الفت و پیار کا طربیہ بظاہر کچھ عجیب تھا ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ان دونوں کو ایک دوسرے سے گہری محبت تھی اور نہ محبت کی پینگیں کسی زمین اور آسمان کے جھگڑے تک کی پرواہ نہیں کرتیں، جہاں ان دونوں کے ماں باپ نے ایک دوسرے پر تمام تعلقات کا دروازہ بند کر لیا تھا وہاں ان دونوں نے اپنے دلوں کی کھڑکی کھول رکھی تھی جس کی راہ سے یہ دونوں ایک دوسرے سے ملتے، پیار اور اختلاط کی باتیں کرتے، شوخی اور دل لگی کی پھلجھڑیاں چھوڑتے اور آئندہ زندگی کے منصوبے گانٹھتے رہتے تھے۔

خدیجہ اور قمر مرزا کے امتحان کا نتیجہ نکلا، وہ بی۔اے اور یہ بی۔ایس۔سی کے امتحان میں کامیاب ہو گئے۔ دونوں کے گھروں میں کامیابی کی خوشیاں منائی گئیں۔ دوستوں، رشتہ داروں کی دعوتیں ہوئیں، مگر نہ وجاہت مرزا کی دعوتوں میں نورالدین کے گھر کا کوئی آدمی شریک ہوا اور نہ نورالدین کے گھر میں وجاہت مرزا کا کوئی آدمی مبارکباد کے لئے آیا۔

خدیجہ کی امتحان میں کامیابی کے چند ماہ بعد نورالدین اور انکی بیوی کو خدیجہ کی شادی کی فکر ہوئی۔ ایک دفعہ جب میاں بیوی اپنے

گھر کے برانڈے میں بیٹھے ہوئے فرصت سے باتیں کر رہے تھے ان کی بیگم نے باتوں باتوں میں یہ ذکر چھیڑا:

"خدیجہ امتحان میں کامیاب ہو کر ماشاءاللہ چھ مہینے ہو گئے اب ہم کو اس کے بیاہ رچانے کی فکر کرنی چاہیئے"۔

"ہاں ہاں" نورالدین نے کہا "لیکن کوئی موزوں لڑکا ملے بھی۔"

"میری ایک دوست پرسوں مجھ سے ملنے آئی تھی جی، اس نے پہلے ادھر اُدھر کی باتیں کیں، پھر خدیجہ کے لئے ڈاکٹر بدرالدین کے لڑکے کا ذکر کیا، لڑکا انجنیئر ہے اور کسی کارخانہ میں پانچ سو روپے کا ملازم ہے، آپ ڈاکٹر بدرالدین کو جانتے ہیں نا؟"

"ہاں ہاں، میں ان کو جانتا ہوں" نورالدین نے کہا۔ "لیکن کیا انھوں نے اس معاملے میں پہل کی ہے؟"

"اگر ہمارا منشاء ہو تو میری دوست ڈاکٹر بدرالدین کی طرف سے پیام لائیں گی" بیگم نے کہا۔

"پہلے لڑکے کے چال چلن، رہن سہن، صحت تندرستی اور اس کی بری ذمہ داریوں کے بارے میں دریافت کر لیں، اس کے بعد ہم اپنا منشا ظاہر کریں۔"

اس گفتگو کے بعد نورالدین اور ان کی بیگم بالا بالا اپنے دوستوں

رشتہ داروں سے ڈاکٹر بدرالدین کے خاندانی اور نجی زندگی کے حالات اور ان کے لڑکے کے چال چلن کے بارے میں دریافت کرتے رہے۔

خدیجہ اور قمر مرزا کے کانوں میں بھی خدیجہ کے لئے بر کی تلاش کی بھنک پڑی اور انھیں ایسا معلوم ہوا کہ ان کے حوصلے اور ہمت کی آزمائش کا وقت قریب آگیا ہے۔ یہ ناممکن تھا کہ قمر بھی خود کو خدیجہ کے باپ نورالدین کے "دائرۂ فرزندی" میں لینے کے لئے پیام بھیجتا اور وہ اس کو قبول کرتے۔ پھر خود اس تجویز عبرت انگیز کا قمر کے باپ وجاہت مرزا کے ذہن پر از رنج ومحن میں آنا محالات عقل سے تھا۔

آہستہ آہستہ شادی کی بات آگے بڑھتی گئی، اور ایک دفعہ ڈاکٹر بدرالدین کے لڑکے کا پیام خدیجہ کے لئے آہی گیا۔ نورالدین اور ان کی بیگم نے ضروری معلومات حاصل کرنے کے بعد بالآخر رضامندی ظاہر کردی اور بیگم کے دوست ہی کے توسط سے لین دین، گھوڑے جوڑے اور مہر وغیرہ کی تفصیلات طے ہوگئیں، دلہن کی طرف سے دُلہا کو آٹھ ہزار روپے گھوڑے جوڑے کے لئے دینا اور اکیس ہزار مہر باندھنا قرار پایا اور ایک مہینے کے بعد ایک مبارک تاریخ بھی مقرر کردی گئی، اور نورالدین کی بیگم کی خواہش کے مطابق سانچق، مہندی، جلوہ، چوتھی کے رسومات کے ساتھ شادی رچانا طے پایا، اس کے ساتھ

شادی کے باقاعدہ انتظامات شروع ہو گئے۔

ان باتوں اور انتظامات کی اطلاع خدیجہ اور قمر کو بھی ہوتی رہی اور ان کی چوری چھپی کی ملاقاتوں میں بھی اضافہ ہوتا گیا۔ شادی کے پیام سلام کے ساتھ خدیجہ اور قمر کے منصوبوں پر پانی پھر گیا تھا اور ان کے دلوں پر اوس پڑ گئی تھی، وہ یہ سمجھے نہ تھے کہ خدیجہ کے والدین اسکی شادی میں اتنی جلدی کریں گے۔ ان کے منصوبے کچھ اور ہی تھے، قمر مکنٹائیل انجنیری میں داخلے کی کوشش کر رہا تھا اور خدیجہ شادی کی مصیبت کو ٹالنے کے لئے بی۔ایڈ اور ایم۔ایڈ کی تکمیل پر اصرار کرتی رہی تھی مگر اس کی ماں چکنی چپڑی باتیں کر کے اس کو منھانے اور پھسلانے کی کوشش کرتی رہی، بالآخر جب یہ مصیبت ٹلتی نظر نہ آئی تو خدیجہ اور قمر اپنے دلوں میں کچھ منصوبہ گانٹھنے کی کوشش میں رہے اور دونوں اسکی تکمیل کے وسایل اور طریقے سوچتے رہے۔

خدیجہ کی شادی کے انتظامات کی خبریں وجاہت مرزا کے گھر والوں کو بھی کسی نہ کسی طرح پہونچتی رہیں اور وجاہت مرزا یہ سن سن کر آگ بگولا ہوتے رہے، ان کو قضیۂ زمین کی مخالفت کے علاوہ اس بات کی بھی کوفت تھی کہ ابھی خود ان کی ایک لڑکی گھر میں بیٹھی ہوئی تھی کہ ان کے "دشمن" کی لڑکی اتنی آسانی سے ایک انجنیر کے لڑکے کے ہاتھ

اٹھ گئی، یہ رشک و حسد کا بھی عجیب جذبہ ہوتا ہے جو مخالفت اور موافقت دونوں حالتوں میں بھی انسان کے دل کا چور ہوتا ہے وجاہت مرزا اس جذبے کا اظہار اس کے اصل انداز میں تو نہیں کر سکے مگر اپنے آپ دانت پیس پیس کر رہ گئے۔

ثمر اور خدیجہ کے دل اس قدم پر جو وہ اٹھانا چاہتے تھے بہت متذبذب و اضطراب میں تھے، کیا وہ ایجاب و قبول کے موقع پر عقد کے قبول کرنے سے انکار کر دے گی؟ یا یہ کہ وہ مرگ و زیست کا کوئی ناسمجھی کا قدم اٹھائے گی؟ کسی پر اُس نے اپنا منصوبہ ظاہر ہونے نہیں دیا۔

بالآخر شادی کے لئے تین دن باقی رہ گئے اور انتظامات ابھی تین دن پہلے تک جتنے اور جیسے ہونے چاہیئے تھے اتنے اور ویسے ہی ہو گئے تھے۔ مہمانوں کے بیٹھنے کے لئے شامیانے نصب ہو رہے تھے، فرش اور دیواریں صاف ہو رہی تھیں، سامان شادی کے مکان کو آرہا تھا روشنی کے قمقمے لگ رہے تھے، دیگیں چولہوں پر چڑھتی اترتی تھیں، رسم سانچق کے مہمانوں کے لئے پکوان ہو رہا تھا ہونے والی دلہن کے ماں باپ کی باچھیں کھلی ہوئی تھیں۔

شام کا وقت تھا، دُلہن اپنے کمرے میں بند تھی، رات کی رسم کے لئے پہننے کے کپڑے اور زیور کمرے کے اندر کشتیوں میں جوڑ کر رکھا

ہوا تھا۔ جب رسم کے لئے دلہن کو تیار کرنے کا وقت آیا اور دلہن کی سہیلیاں اور چند خالہ زاد اور پھوپھی زاد بہنیں دلہن کے کمرے میں آئیں تو دیکھا دلہن کمرے میں موجود نہیں ہے، باتھ روم کا دروازہ بند تھا سمجھیں کہ دلہن باتھ روم میں ہوگی، جب آدھ گھنٹہ گذر گیا اور باتھ روم کا دروازہ نہیں کھلا تو دلہن کی خالہ زاد اور پھوپھوزاد بہنوں نے جاکر دروازہ کھٹکھٹایا اور ہنس ہنس کر بولیں:

"دولہن! بہت شرما چکیں، دروازہ کھولو، وقت ہوگیا ہے!"

لیکن اندر سے صدائے برنخواست، اور نہ باتھ روم کا دروازہ کھلا باہر سے دروازے کو ڈھکیل کر کھولنے کی کوشش کی گئی، دروازہ اندر سے بند تھا نہ کھلنا تھا نہ کھلا۔ باتھ روم کا ایک اور پیچھے کا دروازہ باہر آنگن کی طرف کھلتا تھا چند بہنوں اور سہیلیوں نے جاکر اس طرف سے کھولنا چاہا۔ کیا دیکھتی ہیں کہ دروازہ کھلا ہے اور دلہن ندارد، اب ڈھونڈا ڈھونڈ شروع ہوئی مگر کہیں دلہن کا پتہ نہ تھا، شادی کے گھر میں گڑبڑ مچ گئی، ہر طرف اور ہر ایک کی زبان پر دلہن کا لفظ تھا جتنی تلاش کی گئی اتنی ہی مایوسی ہوئی۔

دلہن کے ماں باپ اور بھائیوں کے ہوش اڑ گئے۔ کاٹو تو لہو نہیں بدن میں، گھر والیاں، مامئیں، اتائیں ادھر ادھر پریشان پھر رہی ہیں۔

اڑوس پڑوس کے مکانوں میں بھی تلاش کرائی گئی کہیں دلہن کا پتہ نہ تھا دلہن کی آرائش کا سامان جو دیکھا گیا تو اس میں سے زیور غائب تھا۔

اس گڑبڑ کی اطلاع جب حشمت مرزا کے مکان میں ہوئی تو ان کو ایک طرح کی مسرت بھی محسوس ہوئی۔ دلہن کے غائب ہو جانے کی اتنی نہیں جتنی ایک اکلوتی بیٹی کے غائب ہو جانے پر نورالدین کی پریشانی اور رسوائی کی۔ انھوں نے اپنی بیوی سے ریشہ خطمی ہو کر کہا:

"دیکھا بیگم! سیدھے لوگوں کو ستانے کا کیا نتیجہ نکلتا ہے! مردم آزار آدمی کو خدا بھی رسوا اور خوار کرتا ہے، اِس ہاتھ دے، اُس ہاتھ لے، دیکھو ایک جوان بیٹی کا عین شادی کے موقع پر گھر سے غائب ہوا، خدا کا قہر نہیں تو اور کیا ہے!"

بیگم کو جو سینے میں عورت کا دل رکھتی تھیں اس واقعہ پر اپنے شوہر کا اتنے کڑے لہجہ میں اظہار جوش و انتقام پسند نہ آیا لیکن وہ کچھ اپنے اور کچھ اپنے شوہر کے جذبات کی رعایت سے بولیں:

"کسی کے گھر کی بہو بیٹی ہو، خدا دشمن کو یہ دن نہ دکھائے۔"

دلہن کے باپ نے نزدیک کے پولیس کے تھانے کو اطلاع کرائی پولیس کی دریافت اور چھان بین سے ایک ملازم نے بتایا کہ ایک پردے لگی ہوئی موٹر دلہن کے باتھ روم کے دروازے پر آ کر ٹھہری تھی، اور

ایک منٹ بھی نہیں ٹھہری کہ چلی گئی۔ ملازم کو کسی قسم کی بدگمانی کا موقع اس لئے نہیں تھا کہ یہ دلہن کا کمرہ تھا، اس نے خیال کیا شائد کوئی بیگم اس دروازے سے اتری ہوں گی۔ اور پھر دلہن کی فراری کا کسی کو سان وگمان بھی نہیں تھا۔

اس واقعہ کو تین دن ہو گئے دلہن کا کہیں پتہ نہ تھا۔ ستم بالائے ستم وجاہت مرزا کے گھر میں بھی ایک کھلبلی مچی ہوئی تھی کہ تین دن سے انکا بیٹا قمر بھی گھر سے غائب تھا اب کڑی سے کڑی ملا کر جو دیکھا گیا اور قمر اور خدیجہ کی پوشیدہ ملاقاتیں بھی منظر عام پر آئیں تو معلوم ہوا اس فراری میں میاں قمر کی سازش کا ہاتھ تھا۔ پولیس نے یہ کہہ کر دست اندازی اور مزید تفتیش کرنے سے انکار کر دیا کہ لڑکا اور لڑکی دونوں بالغ ہیں اور قانونی حیثیت سے وہ اپنی مرضی کے مالک ہیں۔

وجاہت مرزا کو اپنے بیٹے کے غائب ہو جانے کا اتنا رنج اور فکر نہیں تھا جتنا اپنے دشمن نورالدین کی لڑکی کے ساتھ گٹھ جوڑ کر کے غائب ہو جانے کا صدمہ تھا۔ دوسری طرف نورالدین کا حال اور بھی زیادہ خراب تھا۔ ایک طرف اپنی اکلوتی بیٹی کا دلہن بن کر گھر سے غائب ہو جانا اور دوسرے یہ کہ ایک سانپ کے بچے سنپولئے نے نہ صرف ان کی بیٹی کو ڈس لیا تھا بلکہ خود ان کو بھی ڈسا تھا، ان کے گھر میں ایک کہرام مچا ہوا تھا۔

اور خود نورالدین کی حالت دگرگوں ہو رہی تھی، وہ چلّا چلّا کر وجاہت مرزا کو اور ان کے لڑکے کو برا بھلا کہہ رہے تھے اور اس شیطان کو جس نے حوّا کی طرح ان کی بیٹی کو بہکایا گیا تھا لعن طعن کر رہے تھے کہ ایک دفعہ انکو چکّر سا آ گیا اور وہ فرش پر گر پڑے، ان کی زبان بند ہو گئی وہ بول نہیں سکتے تھے ان کے دماغ پر اور جسم کے سیدھے حصّے پر فالج کا حملہ ہو گیا تھا ہزاروں ٹوٹکے کئے گئے۔ ہزاروں نخلخے سنگھائے گئے۔ ڈاکٹروں کو بلایا گیا لیکن سب بعد از وقت تھا۔ نورالدین ایسے گرے کہ پھر نہ اُٹھے اور چار یا پانچ گھنٹے میں جاں بحق تسلیم ہو گئے۔

جب نورالدین جاں بحق تسلیم ہونے کی خبر سارے محلے اور انکے اہل خاندان کو ملی تو لوگ جستہ جستہ ان کے گھر آ کر تعزیت دے گئے اور ان کی اچانک موت کے اسباب پر سب کو تعجب اور افسوس ہوا۔ دوسری طرف جب وجاہت مرزا کے گھر میں ان کے مرنے کی خبر ملی تو اوّل اوّل وجاہت مرزا کو یقین نہ آیا۔ یہ کہنا مشکل تھا کہ آیا ان کے دل نے اس خبر بد کو جذبۂ اطمینان و اتمنان سے سنا، یا حزن و ملال کے کانوں سے۔ البتہ یہ ہم نے یہ دیکھا کہ اس خبر کے سننے کے ساتھ ان کے چہرہ کا رنگ متغیر ہو گیا اور وہ کچھ گہری سوچ میں پڑ گئے۔ چند لمحوں میں نورالدین سے اپنی ابتدائی ملاقات کے دن سے ان کی لڑائی، جدائی اور موت کے وقت تک کے

واقعات چشم زدن میں بجلی کی رفتار سے ان کے دل حزیں میں گذر گئے اور غالباً ان کی آنکھیں کچھ آبدیدہ بھی ہوگئیں۔

اس موقع پر ان کی بیگم اپنے چہرے پر اس عبرت ناک خبر کا کچھ اثر لئے ہوئے ان کے کمرے میں آئیں، اور فرش پر نظریں جمائے ہوئے اپنے شوہر سے مخاطب ہو کر کہا:

"عجیب واقعہ ہوا یہ بھی! کسی کے سان و گمان میں بھی نہیں تمہارا اور پھر قمر میاں اس میں شریک ہیں! دیکھو خدا کی کرنی کیسی ہوتی ہے!"

وجاہت مرزا کچھ نہ بولے، اور کچھ ایسے خالی الذہن سے نظر آئے جیسے کوئی دور کی چیز دیکھ رہے ہیں۔

نورالدین کی موت کو دو مہینے ہو گئے تھے، ان کی غمزدہ بیگم کی طرف سے ایک اعلان مقامی اخبارات میں شائع ہوا:

"میری پیاری بیٹی خدیجہ!"

"تو جس روز سے ہم سے جدا ہوئی ہے اس روز سے ہماری آنکھوں سے نیند اور نور غائب ہو گیا ہے، تیرے فراق میں تیرے باپ بھی اس دار فانی کو سدھارے۔ ہم تجھ سے خفا نہیں ہیں، تو جہاں بھی ہے اس تحریر کو دیکھتے ہی چلی آ بیٹی! ہم سب تیرے لئے چشم براہ ہیں۔

تیری غمزدہ ماں اور تیرے بھائی"

ایک اور اعلان مضمون مندرجہ ذیل کا اخبارات میں شائع کیا گیا۔

"گم شدہ کی تلاش"

"میری لڑکی خدیجہ بانو، عمر ۱۸ سال، میانہ قد، کتابی چہرہ، صندلی رنگ، گوشۂ آبرو پر ایک خال، ہمارے گھر سے چلی گئی ہے۔ جو صاحب ازراہ مہربانی اس کا پتہ بتائیں گے یا اس کے مقام کی نشاندہی کریں گے معقول معاوضہ دیا جائے گا نشاندہی کے لئے پتہ ذیل پر ہم سے مراسلت فرمائیے۔

"بیت النور" انجم نما۔ حیدرآباد"

اُس طرف وجاہت مرزا ایک روز اپنے دیوان خانے میں کرسی پر بیٹھے تلاوتِ قرآن کر رہے تھے کہ ان کی بیگم نے آکر اطلاع دی:

"نورالدین مرحوم کے بیٹے ناصرالدین آئے ہیں آپ سے ملنا چاہتے ہیں۔"

"کیوں مجھ گنہگار سے ان کو کیا کام ہے؟" وجاہت مرزا نے کہا۔

"کہتے ہیں کہ ان کی والدہ نے آپ کو کچھ پیام دیا ہے۔"

"اچھا اندر بلالو!" قرآن بازو کی میز پر رکھتے ہوئے وجاہت مرزا نے کہا۔

بیگم نے ملازم کو بلا کر کہا "باہر ورانڈے میں ایک صاحب کھڑے ہیں ان کو یہاں بھیج دو۔"

ملازم "بہت اچھا" کہہ کر چلا گیا۔

ناصرالدین دیوان خانے میں داخل ہوئے وجاہت مرزا کو سلام کیا اوران کے اشارے پر ایک کرسی پر بیٹھ گئے۔ قبل اس کے کہ وجاہت مرزا سلسلۂ سخن آغاز کرتے ناصرالدین نے کہا:

"والدہ نے آپ کو سلام کہا ہے اور یہ پیام دیا ہے کہ جو نہ ہونا تھا وہ ہوگیا، ہمارے گھر پر ایک قیامت ٹوٹ گئی، اب جن سے آپ کی نزاع تھی وہ نہیں رہے، یہ زمین جس پر آپ کو دعویٰ ہے آپ لے لیں، اور عدالت سے مقدمہ اٹھالیں تاکہ یہ جھگڑا اب ختم ہوجائے۔"

وجاہت مرزا جوش میں آکر بولے "ہرگز نہیں، ہرگز نہیں، میں زمین ہرگز نہیں لوں گا۔"

ناصرالدین نے مفاہمانہ لہجے میں کہا "زمین لے لیجئے، جھگڑے کو ختم کیجئے۔"

وجاہت مرزا نے کسی قدر گرم ہوکر کہا "کہدیا نہیں لوں گا، ہرگز نہیں لوں گا۔ اس زمین کے تعلق سے جن پر میرا دعویٰ تھا وہ تو ختم ہوگئے اب نہ وہ رہے اور نہ جھگڑا رہا۔ اب مجھے عدالت سے کیا کام! مجھے اب زمین نہیں چاہیئے۔"

واقعہ یہ ہے کہ ان کے بیٹے کے ساتھ نورالدین کی بیٹی کی فراری، اور نورالدین کی موت کا واقعہ اس قدر دردانگیز اور عبرتناک تھا کہ

وجاہت مرزا کے دل و دماغ کی کایا پلٹ ہو گئی۔

ناصرالدین نے کچھ تذبذب کی حالت میں کرسی سے اٹھنا چاہا تو وجاہت مرزا نے کہا:

"تم والدہ کو میری طرف سے سلام کہو اور یہ کہدو کہ میں اب زمین نہیں لوں گا اور چند روز بعد عدالت میں درخواست دیکر مقدمہ اٹھا لوں گا۔"

اس بات چیت کو سات آٹھ روز ہو گئے تھے، اس اثنا میں قمر اور خدیجہ گھر واپس ہو چکے تھے اور خدیجہ کے مکان میں ہی مقیم تھے، نورالدین مرحوم کی بیگم اور ان کے لڑکے بھی نزاعی زمین کو واپس لینے کے لئے تیار نہیں تھے۔ ایک جذباتی عذر یہ تھا کہ نورالدین مرحوم زندہ ہوتے تو نہ جانے ان واقعات کے بعد وہ کیا تصفیہ کرتے، اب جبکہ وہ موجود نہیں ہیں ان کے ورثاء کو اس بارے میں تصفیہ کرنے کا اختیار نہیں رہا۔ بالآخر تصفیہ یہ ہوا کہ نزاعی زمین کا حصّہ نہ وجاہت مرزا لیں گے اور نہ نورالدین مرحوم کے ورثاء۔ اور نہ ان دونوں کے مکانوں کے درمیان کوئی حدِّ فاصل کی دیوار اٹھائی جائے گی بلکہ اس مشترکہ خطۂ زمین پر وجاہت مرزا اور نورالدین کی دیرینہ دوستی کی یادگار میں ایک خوبصورت چمن لگایا جائے گا جس کے رنگارنگ گل بوٹے ان دونوں کی یاد کو تازہ کرتے رہیں گے۔ اس چمن کی آبیاری طرفین کے ذمہ ہو گی اس

تصفیہ سے سبھوں نے اطمینان اور مسرت کا سانس لیا۔

اس تصفیے کے مہینے بھر بعد قمر مرزا کے والدین اور خدیجہ بانو کی والدہ اور بھائیوں کی رضامندی سے خدیجہ کی پہلی نسبت ڈاکٹر بدرالدین کے لڑکے سے بصد معذرت منسوخ کر کے قمر اور خدیجہ کا عقد سب کی ہنسی خوشی کے جمگھٹوں اور قہقہوں میں رچایا گیا۔

پنگھٹ پر

دو کوّے ایک قصبے کے پنگھٹ میں ایک کنویں پر سنگت جمائے، پر پھیلائے گپ شپ کرتے بیٹھے تھے، اور کنویں کی منڈیر کے گڑھوں میں جو پانی جمع ہو گیا تھا اس میں کبھی کبھی چونچیں ڈبو ڈبو کر پانی پی رہے تھے، دوپہر کا وقت تھا، پانی لینے کے لئے گاؤں والے اس وقت کنویں پر نہیں آتے تھے، اس لئے کوّے فرصت سے بیٹھے ہوئے باتیں کر رہے تھے کبھی کبھی رم جھم ہو رہی تھی۔ دھان کے ہرے ہرے کھیتوں میں گاؤں کی عورتیں دیہاتی گیت گاتے ہوئے دھان کی کلچائی کر رہی تھیں، بہت پر لطف سماں تھا۔

ایک کوّا اسی قصبہ کا تھا۔ دوسرا کوّا معلوم ہوتا تھا کسی نزدیک کے گاؤں سے اپنے دوست سے ملنے کو آیا ہوا تھا۔ دونوں کلیلہ دمنہ کی طرح حکمت و دانش کی باتیں کرنا اور باتوں میں کہیں کہیں شعر و سخن اور اقوال و امثال کی شکر گھولنا بھی جانتے تھے، یہ بیسویں صدی کے کلیلہ دمنہ تھے۔

گاؤں میں آج کچھ زیادہ چہل پہل تھی، ایک آدھ موٹر بھی آتی جاتی نظر آتی تھی اور اس طرف سے کچھ باجے اور شہنائی کی سریلی آواز بھی

آرہی تھی۔

باہر کا کوّا (کائیں کائیں) آج تمہارے گاؤں میں کچھ زیادہ چہل پہل نظر آتی ہے۔

قصبہ کا کوّا (کائین کائیں) ہاں گاؤں میں سورج مل مہاجن کی لڑکی کی شادی کی دھوم ہے، مہمان آجا رہے ہیں، اس کے مکان کے سامنے کے میدان میں ایک منڈپ موز کے پتوں اور گیندکے پھولوں سے سجایا گیا ہے، برہمن کھانا کھا رہے ہیں، ہم کوّوں کی بھی چار دن سے دعوت اڑ رہی ہے، پتر ولیوں کا گرا پڑا کھانا ہم کو بھی نصیب ہو رہا ہے، ایک طرف یہ مہاجن اپنی لڑکی کی شادی میں اتنا پیسہ اڑا رہا ہے، دوسری طرف اسی گاؤں میں غریب کھانے کو ترس رہے ہیں، چند روز پہلے میں اس مہاجن کی دوکان کی دیوار پر بیٹھا ہوا تھا، ایک مفلوک الحال عورت اس سے اپنی لڑکی کی شادی کے لئے کچھ قرض مانگنے کو آئی۔ اس سنگدل نے پہلے تو اس کو دھتکار دیا، پھر اس عورت کی ہزار منت و زاری پر دو سو روپے میں سے بیس روپے سود منتی کے نام سے کاٹ لئے اور ایک سو اسّی روپے قرض دئے، دو مہینے کے بعد فصل کی کٹائی پر واپس کرنے کے اقرار سے۔ اس کے علاوہ اس قصبے میں جو ایک پنچایت سمیتی قائم ہوئی ہے نا، اسکی طرف سے ایک ہلتھ سنٹر بنا ہے کوئی منسٹر جو اس نواح میں دورہ کر رہا ہے

دو تین روز بعد اس کا افتتاح کرنے والا ہے، لوگ اسی کی تیاریاں کر رہے ہیں۔

باہر کا کوا (کائیں کائیں) یہ ہلت سنٹر کس چڑیا کا نام ہے؟

قصبہ کا کوا (کائیں کائیں) ارے ناداں یہ چڑیا کا نام نہیں، دواخانہ کا نام ہے، تھوڑے دن سے جو سمیتیاں قائم ہوئی ہیں نا، ان کے چند منچلے لوگ گاؤں گاؤں میں دواخانے قائم کر رہے ہیں پھر اپنی گاؤں میں دیکھو تو بیماروں اپاہجوں کی کمی نہیں۔

باہر کا کوا (کائیں کائیں) ہزار دواخانے قائم کرو، غذا برابر نہیں، جسم میں طاقت نہیں تو بیمار کیسے اچھے ہوں گے؟

قصبہ کا کوا (کائیں کائیں) اور پھر گاؤں میں جگہ جگہ گندگی اور غلاظت نظر آتی ہے۔

باہر کا کوا (کائیں کائیں) جب تک ان آدمیوں کے دماغ اور سماج کی گندگی دور نہ ہوگی گاؤں کی اور شہروں کی گندگی اور بیماری دور نہ ہوگی بات یہ ہے کہ ان میں پاکی صفائی کا کوئی احساس ہی نہیں ہے جتنا صاف کرتے ہیں اس سے زیادہ غلیظ کرتے ہیں، ہم کوے نہ ہوئے تو نہ جانے انکے گاؤں کی گندگی کا کیا حال ہو، اور کیسی کیسی بیماریاں پھوٹ پڑیں۔

پنگھٹ سے کچھ دور چند لڑکے شور مچاتے نعرے لگاتے، ناچتے کودتے چلے جاتے تھے، اس غول کے شور وغل پر کووں نے کان کھڑے کئے۔

قصبہ کا کوّا (کائیں کائیں) آج کل ان لونڈوں کی بھی عجیب بانکی ہے جب کہ مدرسے نہیں تھے یہی لڑکے گلی کوچوں میں ٹامک ٹوئیاں مارتے یا درختوں میں پرندوں کے گھونسلے تاکتے اور ان کے بچے نکالتے پھرتے تھے اور اب جب سے گاؤں گاؤں اور شہر شہر میں اسکول قائم ہوگئے ہیں، یہ لڑکے پڑھتے لکھتے کم ہیں اور بات بات پر اسٹرائیک کرکے ایک طرف اپنی پڑھائی خراب کرتے اور دوسری طرف لوگوں کا سامان توڑ پھوڑ کر نقصان کرتے پھرتے ہیں زیادہ۔ کل کی بات ہے میں ایک درخت کی شاخ پر بیٹھا ہوا تھا، ایک شریر لڑکے نے مجھے غلیل کا نشانہ بنایا۔ شکر ہے میں بال بال بچ گیا۔ یہ لڑکے بھی بڑے شیطان ہوتے ہیں۔

باہر کا کوّا (کائیں کائیں) اگر آنے والی نسل کے یہی لچھن رہے تو پھر اس کا بھی خدا ہی حافظ ہے، میں کہتا ہوں کہ کم از کم دو چار سال تک ان اسکولوں اور کالجوں کو چھٹی دے دینی چاہیئے جس کے بعد ممکن ہے ان کے دماغ درست ہو جائیں۔

قصبہ کا کوّا (کائیں کائیں) لیکن یار میں، اس میں لڑکوں کے علاوہ استادوں کا بھی دوش معلوم ہوتا ہے، اسکولوں میں داخلے ملنے کی رکاوٹیں تدریس و تعلیم میں طریقۂ تعلیم اور نتائج امتحان کے نقائص اور تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد دیس میں روزگار ملنے کی دشواریاں، یہ سب،

باتیں لڑکوں میں بے چینی اور اضطراب اور انتشار پیدا کر رہی ہیں،
رہے استاد، ان کو لڑکوں کی ان مشکلات کا احساس ہے اور نہ اندازہ
ایک وہ بھی زمانہ تھا کہ بقول ایک شاعر کے ؎

تھے وہ بھی دن کہ خدمت استاد کے عوض
دل چاہتا تھا ہدیۂ دل پیش کیجئے

اب استادوں اور لڑکوں کا نہ وہ رشتہ رہا اور نہ وہ اختلاط۔

کنویں کے قریب ایک ببول کا درخت تھا جہاں سے بلبل کی پٹ پڑدول
پٹ پڑدوں کی سریلی آواز آئی۔

باہر کا کوّا (کائیں کائیں) ہماری یہ فطرت کی مُغنیہ ان لونڈوں
کے بھونڈے نعروں کے مقابلہ میں کیسے سریلے بول بول رہی ہے! کاش
انسان ان فطرت کے آرٹسٹوں سے کچھ سیکھتا! ہم کووں سے بھی وہ
بہت کچھ سیکھ سکتا ہے ــــــ ہمدردی، میل جول، ایک دوسرے کا خیال،
سب کو برابر بانٹ کر کھانا!

قصبہ کا کوّا (کائیں کائیں، پہلے کوے کے آخری الفاظ دہراتے ہوئے)
سب کو برابر بانٹ کر کھانا! یہی تو آج دنیا کا سب سے بڑا ہنگامہ خیز
مسئلہ ہے، دوست! یہی سورج مل مہاجن اور اس مفلوک الحال عورت
کا مسئلہ ہے، یہی سرمایہ داروں اور دست کاروں کا مسئلہ ہے، یہی چھوٹی
طاقتوں اور بڑی طاقتوں کا مسئلہ ہے، یہی حق اور ناحق کا مسئلہ ہے۔

باہر کا کوا "(کائیں کائیں) لیکن بھائی، میں نے سنا ہے کہ بعض ملکوں نے اس مسئلہ کو حل کر لیا ہے یا یہ کہ حل کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔

قصبہ کا کوا (کائیں کائیں) شنیدہ کَے بود مانند دیدہ! حل کیا ہو یا کرنا چاہتے ہوں لیکن میں تو یہی دیکھ رہا ہوں کہ ان ملکوں میں بھی وہی جبر و اقتدار ہے؛ وہی قومی اور بین الاقوامی کشمکش، وہی فرد کے فکر و خیال اور گفتار و رفتار پر پابندی ہے جو دوسرے ملکوں میں ہے، آزاد معاشرے کا خواب سہانا تو ہے لیکن اب تک وہ کہیں شرمندۂ تعبیر نہیں ہوا۔ دنیا میں حق و انصاف کہاں ہے، کسی شاعر نے کہا ہے ؎

عالم ہے مکدر کوئی دل صاف نہیں ہے ۔۔۔ دنیا میں سبھی کچھ ہے پہ انصاف نہیں ہے

"چھپر غیو، چیر غیو" بازو کے ایک چھوٹے سے سبزہ زار سے میناؤں کے بولنے کی آواز آئی، جو ہری ہری گھانس میں تنکے اور کیڑے چن چن کر کھا رہی تھیں اور کوؤں کی باتیں سن رہی تھیں۔

ایک مینا (چیر غیو، چیر غیو) تم کوے حق و انصاف کی باتیں کرتے ہو لیکن یہ بھی سوچا ہے کہ ہم میناؤں کے انڈے اور بچے کس مزے اور بے دردی سے اڑا لے جاتے ہو؟ دکھ بھری بی مینا، کوے انڈے کھائیں یہ کہاں کا انصاف ہے!

کوؤں نے مینا کا یہ طنزیہ فقرہ سن کر ان کا نوٹس لیا اور بھیگے ہوئے

پروں سے پانی جھاڑنے کے لئے پھریری لے کر کہا:

قصبہ کا کوّا (کائیں کائیں) بی مینا، ذرا ہوش کی باتیں کرو، یہ جو تم گھانس سے کیڑے چن چن کر کھا رہی ہو تو کیا ان ننھے ننھے کیڑوں اور ان کے انڈوں بچوں سے انصاف کر رہی ہو؟ مینا خانم! قدرت کا یہی قانون ہے کہ چھوٹی مخلوق بڑی مخلوق کی غذا اور پرورش کے کام آئے پھر ہم کوّے اگر تمہارے یا فاختاؤں کے انڈے بچے کھائیں اور تم ان کیڑوں کے انڈے بچے کھاؤ تو کیا فرق ہوا! اگر وہ ظلم ہے تو یہ بھی ظلم ہے بی مینا۔

مینائیں یہ تڑاق پڑاق جواب سن کر خاموش ہوگئیں اور ظالم کوّوں سے حجت کرنا بے سود سمجھ کر تنکے اور کیڑے چننے میں لگ گئیں اور کوّے اپنی باتوں میں لگ گئے۔

ٹھیک اس وقت گاؤں کی طرف سے تڑا تڑ بندوقیں چھوٹنے کی آواز آئی جس سے کوّے ڈر کر اڑ گئے۔ بستی سے مہاجن کی لڑکی کی شادی کا جلوس نکل رہا تھا اور لوگوں کا ہجوم جلوس کے ساتھ تھا کوّے دھان کے کھیتوں پر سے اڑتے ہوئے غائب ہوگئے۔

عدالت کا فیصلہ

پیراں صاحب اور میراں صاحب موضع پنچولی کے زمیندار آپس میں سگے بھائی تھے، جہاں ان کی پیڑیوں کی نال گڑی تھی، پیراں صاحب کی عمر (۵۰) سال تھی اور میراں صاحب کی ۴۵ سال، یہ دونوں بھائی اپنے باپ کی زندگی تک ایک گھر میں ہی رہا کرتے تھے اور باپ کی زمینات مل کر کاشت کرتے اور فصل کٹنے پر اخراجات نکال دینے کے بعد جو پیداوار بچ رہتی وہ برابر برابر تقسیم کر لیتے تھے، باپ کے مرنے کے بعد میراں صاحب اپنا ایک الگ مکان بنا کر اس میں رہنے لگے تھے جس کو تقریباً دو سال کا عرصہ ہو گیا تھا۔

دونوں بھائیوں میں باپ کے متروکہ کے بارے میں نزاع تھی، نزاع صرف ایک کھیت کے بارے میں تھی جس کی سیرابی تالاب سے ہوتی تھی اور جو زرخیز تھا۔ متروکہ کی تقسیم کی ضمن میں پیراں صاحب اس کھیت کو اپنے حصے میں لینا چاہتے تھے اور میراں صاحب اپنے حصے میں۔ اس نزاع کا کسی طرح تصفیہ نہیں ہو رہا تھا۔ آپس کے تعلقات کشیدہ ہو گئے تھے۔ اس نزاع کے

تصفیے کے لئے گاؤں کی پنچایت بھی ہوئی۔ لیکن کوئی تصفیے کی صورت نہیں نکلی، دو سال تک کھیت بلا کاشت افتادہ پڑا رہا جبکہ پیراں صاحب اور ان کے ملازم نے اس کھیت میں کاشت کر کے اس پر زبردستی قبضہ کرنا چاہا اور چانول کی کاشت کر ہی دی تو ان کے بھائی نے ایک دن راتوں رات چند مزدوروں کو لگا کر فصل اکھڑوا دی، اس سلسلہ میں کچھ فوجداری بھی ہوئی۔ پولیس کے کانسٹبل کھیت پر آئے اور گاؤں والوں سے کچھ دریافت کیا۔ چونکہ نزاع حقیت کی تھی عدالت دیوانی سے حقیت کا تصفیہ کرانے کے لئے پولیس نے دونوں فریق کو ہدایت دے کر امن قائم رکھنے کے واسطے مچلکہ کا پابند کرا دیا۔

اس واقعہ کو چھ مہینے نہیں ہوئے تھے کہ ایک دن پیراں صاحب گھر سے دفعتاً غائب ہو گئے۔ سارے گاؤں میں ان کے گھر والوں نے ان کی تلاش کرائی لیکن کہیں ان کا پتہ نہیں چلا، دو چار دن میں قریب کے دو چار گاؤں بھی جہاں ان کے جانے کا امکان تھا چھان مارے گئے۔ پولیس کو اطلاع دی گئی مگر ان کا کہیں پتہ نہ تھا۔ پولیس کی تفتیش جاری تھی کہ ان کے غائب ہونے کے پندرہ روز بعد پڑوس کے گاؤں کے ایک بڑے تالاب میں ایک ماہی گیر کو ایک آدمی کی نعش نظر آئی جو سڑ گل کر ناقابل شناخت ہو گئی تھی، پولیس کو اطلاع ہوئی نعش کیا

پنچنامہ ہوا اور پولیس نے ڈیڑھ مہینے کی تفتیش کے بعد میراں صاحب کے خلاف عدالت فوجداری میں چالان دائر کر دیا۔

چار مہینے کے عرصے میں عدالت کی کئی پیشیاں ہوئیں، استغاثہ اور ملزم کی طرف سے شہادت میں بیس بیس گواہ پیش ہوکر ان کے بیانات قلمبند ہوئے جن کے منجملہ ایک ڈاکٹر کی گواہی بھی ہوئی جس نے تصدیق کی کہ وہ میراں صاحب کا معالج تھا اور یہ کہ بعض اوقات میراں صاحب پر ایک خفقانی دورہ پڑتا تھا اور وہ جنون اور وحشت کی حالت میں بھٹک کر کہیں نکل جاتے تھے۔ ان بیانات پر جرح اور جرح مکرر ہوئی ایک پیشی پر استغاثہ اور وکیل ملزم کے طویل مباحث ہوئے جس کا سلسلہ چار روز تک جاری رہا۔ فاضل جج نے مقدمے کے واقعات اور گواہوں کے بیانات کے بارے میں استغاثہ اور ملزم کے وکلا سے چند ایسے چبھتے ہوئے سوالات کئے جن سے جج کی ذہانت اور قانونی بصیرت کا پتہ چلتا تھا ملزم کا وکیل مطمئن تھا کہ اس نے ملزم کی برات میں شہادت کی کمزوریوں اور قانونی دفعات اور نظائر کے حوالوں سے جج کو اپنے موکل کی بے گناہی کا قائل کر دیا تھا۔

فاضل جج نے فریقین کے وکلا کی بحث کے ختم ہونے کے بعد فیصلہ سنانے کے لئے ایک تاریخ مقرر کر دی اور عدالت کا اجلاس برخواست ہوا۔

تاریخ مقررہ پر جب جج نے اپنا فیصلہ سنایا تو خلاصہ واقعات سے بحث کرتے ہوئے اپنی تقریر میں بتایا کہ اگرچہ شہادتِ رویت کی کمی ہے لیکن واقعاتی شہادت سے ملزم کے خلاف جرم ثابت ہوتا ہے اور واقعات مقدمہ پر تفصیلی نظر ڈال کر جج نے قتل انسان مستلزم سزا کی دفعہ کے ماتحت ملزم کو پانچ سال قید بامشقت کی سزا سنائی۔

....

عدالت کے اس فیصلے کے بعد میراں صاحب کے گھر میں ایک کہرام مچ گیا، ان کی بیوی نے جب یہ خبر سنی تو سر پیٹنے لگی اور میراں صاحب کو اور ان کی بیوی اور بیٹی کو جوان کی بہو تھی کو سنے کاٹنے لگی، میراں صاحب نے جو شروع سے اپنے تئیں بے گناہ سمجھے ہوئے تھے، اس فیصلہ کو خون کے گھونٹ پی کر خاموشی سے سنا اور اپنے وکیل سے اس کے خلاف عدالتِ مافوق میں اپیل کرنے کو کہا، عدالت کے فیصلے میں منجملہ ان واقعات کے جو ملزم اور مقتول کے مابین پچھلے چند مہینوں سے مابہ النزاع تھے اس لنگی کو بھی داخل شہادت قرار دیا گیا جو نعش کی طرح ناقابل شناخت ہو گئی تھی، میراں صاحب کبھی لنگی بھی باندھا کرتے تھے۔

میراں صاحب نے وکیل سے بھرائی ہوئی آواز میں کہا:

میں بے گناہ ہوں، بالکل بے گناہ ہوں، میرے ہاتھ بھائی کے خون سے

آلودہ نہیں ہیں، فیصلہ غلط ہے، یہ ان مفسدوں کی سازش اور شرارت ہے جو میرے بھائی کو مجھ سے لڑا کر اپنا الو سیدھا کر رہے تھے اور مجھ سے بھی کچھ پیسہ گھسیٹنا چاہتے تھے۔"

"پھر تو ہم کو اپیل میں کامیابی کا یقین ہے، عدالت نے ہماری شہادت کا صحیح موازنہ نہیں کیا۔ ہم اپیل میں ضرور کامیاب ہوں گے، عدالت اپیل میں فوجداری کے ایک قابل وکیل میری نظر میں ہیں" وکیل نے میراں صاحب کو اطمینان دلانے کے لہجے میں کہا۔

"تو پھر آپ اپیل کی کاروائی جلد کیجئے! اخراجات اپیل کے لئے میرے لڑکے سے پیسے لے لیجئے۔"

میراں صاحب کی لڑکی بی جان میراں صاحب کی بہو تھی، دیورانی جیٹھانی کے ایک دوسرے کو کوسنے کاٹنے ہو ہی رہے تھے کہ بی جان اور اس کے شوہر محبوب میاں کے تعلقات میں ایک عجیب قسم کی کشیدگی پیدا ہو گئی تھی، محبوب میاں کو یقین نہ آتا تھا کہ اس کے باپ نے اپنے ہاتھ اس کے چچا کے خون سے رنگے ہوں گے، پھر بھی اس کے دل میں اپنے باپ کے خونی ہونے کا چور چٹکیاں لے رہا تھا، بی جان کے دل میں بھی یہ بات کانٹے کی طرح کھٹک رہی تھی کہ اس کا شوہر اس کے باپ کے قاتل کا بیٹا ہے، جذبات کی اس کشمکش سے زن و شو کے

تعلقات میں کچھ سرد مہری سی آ گئی تھی اور اگر کبھی وہ دو چار ہوتے بھی تو انجان انجان سے رہتے تھے، جیسے دونوں کے دلوں میں کوئی چور ہے۔

بی جان کی ماں کو میراں صاحب کے قاتل ہونے کا یقین تھا ایک دن اس نے روتے ہوئے اپنی بیٹی سے کہا:

"ہائے، اس ظالم نے مجھے رانڈ بنا دیا، ایک زمین کے ٹکڑے کے لئے اپنے سگے بھائی کا خون! دنیا کا خون کیسا سفید ہو گیا ہے! اب سے اس قاتل کے بیٹے سے تیرا کوئی تعلق نہ ہوگا۔"

"لیکن اماں! کیا آپ کو یقین ہے کہ میرے چچا نے ہی میرے باوا کو مار ڈالا ہے" بیٹی نے پوچھا۔

"یقین کی بچی!" ماں نے جھنجھلا کر جواب دیا "عدالت کے فیصلے میں تو خون اس ظالم کی گردن پر ثابت ہی ہو چکا ہے، تو بڑی عقلمند بکتی ہے، کیا میرے چچا نے ہی میرے باوا کو مار ڈالا ہے؟ دیوانی کہیں کی! جو بھی ہو وہ قاتل کا بیٹا ہمارے گھر میں نہیں آنے پائے گا، آستین کا سانپ ہے۔"

اب بی جان ایک اور کشمکش و پیچ میں پڑ گئی۔ فیصلہ کے بعد سے اس کے اور اس کے شوہر کے تعلقات پہلے ہی سرد پڑ گئے تھے، اب اس کی ماں کے اس حکم نے کہ یہ تعلقات توڑ ہی دئے جائیں اس کو

عجیب مخمصے میں ڈال دیا تھا اور خود اس کے رنڈاپے کا نقشہ اس کی آنکھوں میں پھر رہا تھا۔

اُدھر محبوب میاں کی ماں نے جو اپنی جیٹھانی اور اپنی بہو پر بات بات میں غصہ اتار رہی اور لعن طعن کر رہی تھی، ایک دفعہ ٹسوے بہاتے ہوئے اپنے بیٹے کو تاکید کی:

"خبردار! اس ناگن کو منہ نہ لگانا، جسے اپنے سگے چچا کو پانچ سال کی کال کوٹھری میں ڈلوانے سے شرم نہ آئی، یہ اُس کی اور اُس کی ماں کی کارستانی ہے ورنہ میں اب بھی کہتی ہوں اور دنیا سے برملا کہوں گی کہ تیرا باپ بے قصور ہے"۔

بیٹا کس بات کا یقین کرتا؟ اپنی ماں کے کہنے کا! اپنے باپ کی بے گناہی کا، یا اپنے دل کے چور کا؟

بیٹے نے ماں کے غصے کی رعایت کرکے دبی زبان سے اپنے اس شبہ کا اظہار کیا:

"مگر اماں! پھر میرے چچا کو کس نے اس بُری طرح سے مار کر پانی کی مچھلیوں کو کھلا دیا ہوگا؟ اس کا اور کون دشمن تھا؟ کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا معمہ ہے"۔

ماں نے بگڑ کر کہا، دشمن کے بچے! کوئی اور نہیں مار ڈالا تو

تیرا باپ ہی اُس کو مار ڈالا کیوں؟ تیرا چچا کچھ سٹری تو تھا ہی، جُنونی، یہ بھی ہو سکتا ہے نا؟ سڑے پن میں گاؤں کے اس ویران تالاب کی طرف نکل گیا ہو گا، وہاں کچھ اس پر جنون طاری ہوا ہو گا۔ پاؤں ہی پھسل گیا ہو گا، اور پانی میں گر کر مر گیا ہو گا، کیوں کیا یہ نہیں ہو سکتا؟

"ماں نے محبوب میاں کے باپ کے بچاؤ میں جو یہ بات کہی تو بیٹے کے دماغ میں باپ کی صفائی کی کچھ روشنی نظر آئی اور اس معاملے میں اس کو اپنی چچی ساس، اور بیوی کے شبہات کی اور عدالت کے فیصلے کی زیادتی کا احساس ہوا۔

اس دوران میں گاؤں میں دو گروہ بن گئے تھے، ایک پیراں صاحب کا اور ایک میراں صاحب کا۔ ایک گروہ پیراں صاحب کے بے دردانہ قتل اور ان کی مظلومیت کا اور ان کی بیوی بچوں کی فلاکت و مجبوری کا دم بھرتا تھا، اور دوسرا میراں صاحب کی نیکی اور بے گناہی کا جھنڈا بلند کرتا تھا۔ ان دو گروں کا تعلق ملک کے یا پھر اس گاؤں کے دو سیاسی گروہوں سے تھا جو باہم دست و گریباں رہتے تھے، اس گاؤں کی پنچایت سمیتی کے پریسیڈنٹ کا چناؤ ہو رہا تھا جس میں پیراں صاحب کا گروہ ایک سیاسی گروہ کی تائید کر رہا تھا تو میراں صاحب کا

گروہ دوسرے سیاسی گروہ کی تائید میں تھا، جس کے نتیجہ میں پیراں صاحب کے گروہ اور میراں صاحب کے گروہ میں "پیراں نمی پرند مریداں می پرانند" کے مصداق جوتیوں میں دال بٹ رہی تھی اور مردہ باد، زندہ باد کے نعرے بلند ہوتے رہتے تھے۔

اس کے ساتھ ان دو گروہوں کی عبادت گاہیں بھی الگ الگ ہوگئیں جن میں یا تو پیراں صاحب کے ہی چیلے چانٹے عبادت کے لئے جاتے تھے یا میراں صاحب کے ہی۔ پھر گاؤں میں ان کی آمد و رفت کی راہیں جدا جدا ہوگئیں، ان کے پانی پینے کے کنویں الگ الگ ہو گئے، ان کی بیٹھکیں الگ الگ ہوگئیں۔ غرض ان دونوں گروہوں کا زمین و آسمان علیحدہ علیحدہ ہوگیا۔ پیراں صاحب کی ضد اور نزاع میں اتنا رنگ نہیں تھا جو اس چھوٹے سے گاؤں کے ہنگاموں میں پیدا کر دیا گیا تھا اگر ان ہنگاموں اور تماشوں پر اتنا پیسہ صرف نہ ہوتا اور ان کے نتیجہ میں اتنی اخلاقی پستی اور سفلے پن کی نمائش نہ ہوتی تو پھر یہ تماشے رچے نہ تھے اور یہ سودا گراں نہ تھا، یہ سمجھنا مشکل بھی تھا اور آسان بھی کہ یہ تماشے کون کرا رہا تھا۔

بہرحال گاؤں میں پیراں صاحب اور میراں صاحب کے گھر کے اندر اور باہر انسانی تعلقات خراب ہو رہے تھے خود دونوں کے

گھر والوں کے اور باہر ان کے پیروؤں کے، کہا جاتا ہے کہ عدالت کے مقدمے کی پیروی میں بھی پیسہ خوب صرف ہوا تھا۔ پیراں صاحب یا میراں صاحب کے گھر میں تو اتنی دولت نہیں تھی کہ وہ اس پیروی کیلئے روپے کی تھیلیوں کے منھ کھول دیتے۔ چند کھیت گرو رکھوائے گئے۔ دیورانی اور جیٹھانی کی لڑائی اور ایک دوسرے کے خلاف سب وشتم ایک طرف تھی اور دوسری طرف محبوب میاں اور بی جان کے تعلقات سرد ہوتے ہوتے ٹوٹنے کے قریب ہو گئے تھے اور پھر سزا کے خلاف اپیل کا ایک مرحلہ باقی تھا۔ نتیجہ یہ کہ دونوں گھروں کی نفسیاتی فضا خراب تھی سو تھی، مالی حالت بھی خراب ہو گئی تھی، مقدمہ کی وجہ سے دونوں گھروالوں کے آدھے سے زیادہ کھیت اس سال بوئے نہیں گئے تھے اور بقیہ کھیتوں کی پیداوار سے اونے پونے دام ہی وصول ہوئے تھے۔

میراں صاحب کی اپیل کی تیاری ہو رہی تھی، چند کاغذات کے نقول حاصل کئے جا رہے تھے، ایک دن شام کا وقت تھا ایک موٹر گاؤں میں آئی، اس گاؤں میں موٹر آنا ایک غیر معمولی بات تھی، یہ موٹر گاؤں کی گلیوں کے موڑ کاٹتی ہوئی پیراں صاحب کے مکان پر آ کر رکی، ڈیوڑھی کا دروازہ بند تھا اور ایسی خاموشی تھی جیسے سانپ سونگھ گیا ہو، موٹر میں سے ایک صاحب نے اتر کر دروازہ کھٹکھٹایا،

کچھ دیر کے بعد دروازہ کھلا تھا کہ موٹر میں سے پیراں صاحب اتر کر خراماں خراماں آئے اور اپنی بیٹی کو جو دروازے میں نیم پردہ ہو کر دیکھ رہی تھی پکارا۔

"بی جان!"

بی جان کا دم ہی نکل گیا، وہ ایک خوفزدہ مدہوشی کے عالم میں تھی اس کو یقین نہ آتا تھا کہ وہ جو کچھ دیکھ رہی ہے وہ حقیقت ہے کہ خواب وہ دوڑی ہوئی پلٹ کر گھر کے اندر گئی اور اپنی ماں کو مطلع کیا، اس کی ماں سہمی ہوئی بی جان کے ساتھ دیوڑھی کے دروازے کی طرف دوڑی آئی، اتنے میں پیراں صاحب خود دیوڑھی کے اندر آچکے تھے، دونوں کو اس کا یقین نہ آیا کہ یہ پیراں صاحب ہیں یا ان کی روح، پیراں صاحب نے اپنے ہاتھ اور سر ہلا ہلا کر، کان اور ناک مروڑ مروڑ کر، قہقہے لگا لگا کر اور قدم آگے بڑھا بڑھا کر ان دونوں کو یقین دلایا کہ وہ گوشت پوست اور استخواں کے پیراں صاحب ہیں اور بقید حیات ہیں، پھر پیراں صاحب دیوان خانے میں گئے اور اپنے دوستوں کو جو موٹر سے آرہے تھے شکریہ کے ساتھ رخصت کیا اور گھر کے اندر آکر برآمدے میں تخت پر بیٹھ گئے اور اپنے گاؤں سے غائب ہونے کے بعد سے واپسی تک کی داستان سنانے لگے، قصّہ کو مختصر کرتا ہوں، انھوں نے شروع سے لیکر بتایا کہ

کس طرح وہ جس دن گاؤں سے غائب ہوئے تھے، بھٹکتے ہوئے شاہ راہ عام تک پہونچ گئے تھے اس وقت ایک سرکاری بس سڑک پر سے گذر رہی تھی ان کے دل میں کیا ترنگ آئی کہ وہ اس کو ٹھہرا کر سوار ہو گئے اور اپنے ایک پرانے دوست کے شہر کو جو ان کے گاؤں سے بہت دور تھا پہونچ گئے اور وہاں جاکر اپنے گھر بار اور افکار کو بھولے تھے سو بھولے تھے گھر کو خط لکھنا بھی بھول گئے اور یوں بھی وہ کسی کو اپنا اتا پتا معلوم کرانا نہیں چاہتے تھے، پھر جب ان کے وہ شہر کے دوست کسی عدالتی کارروائی کی ضمن میں ان کے گاؤں کے قریب سے گذر رہے تھے تو انھوں نے ان کو اپنی موٹر میں گھر پہونچا دیا۔ یہ ساری داستان ان کی بیوی اور بیٹی بھبوت سی بنی کھڑی سُن رہی تھیں اور وہ ان کی پریشانی و بدحواسی اور گاؤں والوں کی حیرانی و ہراسانی پر قہقہہ اڑا رہے تھے، بی جان پہلے اپنے چچا کے گھر دوڑ کر گئی اور محبوب میاں کو اور اپنی چچی ساس کو اس کی خبر دی، ان دونوں کا اُس وقت جو عالم ہوا وہ دیکھنے سے تعلق رکھتا تھا۔ میراں صاحب تو جیل میں تھے، رفتہ رفتہ یہ خبر سارے گاؤں میں اور اڑوس پڑوس کے گاؤں۔ اور قصبوں اور شہر میں پھیل گئی، پریس کے لوگ اور اخباری نمائندے پیراں صاحب کے گھر پر دوڑے آئے، اور ساری داستان انھوں نے پریس والوں سے دہرائی، دوسرے روز

ملک کے اخباروں اور جریدوں میں عدالت کے فیصلے کے حوالہ سے یہ خبر جلی سرخیوں میں اس طرح شایع ہوئی :

"پنچولی میں مردہ زندہ ہوگیا"

"مردے کی نئی زندگی" گھر کو بہ صحت ہوش و حواس واپسی"

"رسیدہ بود بلائے ولے بخیر گذشت ، بے گناہ مجرم"

"مُردہ بہ دست زندہ" وغیرہ ، وغیرہ

میراں صاحب اور ان کے وکیل کو جو اپیل داخل کرنے کی تیاری کر رہے تھے، جب یہ خبر پہونچی تو پہلے ان کو اس خبر کا یقین نہ آیا اور اس کو چند منچلوں کا مذاق سمجھا لیکن جب پیراں صاحب کے بقید حیات ہونے کی معتبر ذرائع سے تصدیق ہوگئی تو میراں صاحب پر ایک عجیب ہیجانی کیفیت طاری ہوگئی اور ان کے وکیل نے سزا کی عدالتی کارروائی کو فوری منسوخ کرانے اور مقدمہ کی تمام کارروائی کو منسوخ اور کالعدم قرار دینے اور استغاثہ کے خلاف ہرجے خرچے کا دعویٰ کرنے اور میراں صاحب کو پہلے قید زنداں سے چھڑانے کے لئے ضابطہ کی کارروائی شروع کردی ، اخباروں میں اس مقدمے کی تمام روداد پر جس میں ایک بے گناہ شخص کو مجرم قرار دے کر عدالتی کشاکش اور مالی اور ذہنی پریشانیوں میں ناحق مبتلا کیا گیا تھا خوب لے دے ہوئی ،

اور تفتیش اور استغاثہ کی بے احتیاطیوں اور بدعنوانیوں پر بہت کچھ رد و قدح تنقید اور سرزنش کی گئی، پولیس کی بعد از وقت تفتیش میں پتہ چلا کہ جس شخص کی نعش پر پیراں صاحب کی نعش کا دھوکہ ہوا تھا وہ کسی اور ہی لاوارث نوجوان کی نعش تھی جو کسی دور کے گاؤں کا رہنے والا تھا اور جو اپنی بے روزگاری، بے کاری اور بے حیائی کی زندگی سے تنگ آکر پانی میں ڈوب مرنے کی ٹھانی تھی اور شہادت کے نقص و نارسائی اور تفتیش کی عجلت اور بے پرواہی کے باعث سوء اتفاق سے میراں صاحب کی پریشانی اور عدالتی کشاکشی کا باعث ہوا تھا۔

اس کے بعد بہت دنوں تک دور دور اس واقعہ کے چرچے رہے اور پیراں صاحب کی برات اور زندان سے واپسی کے بعد چند صلح پسند عزیزوں اور دوستوں کی کوشش سے پیراں صاحب اور میراں صاحب کے تعلقات رفتہ رفتہ درست ہوتے گئے، میراں صاحب کی پریشانیوں اور ان کے خلاف فوجداری کارروائی میں خود ان کے بھائی کا ہاتھ نہیں تھا البتہ اس صلح سے دونوں بھائیوں کے حاشیہ برداروں کو مایوسی ہوئی، اب بھی جب اس واقعہ کا ذکر پیراں صاحب کسی کے سامنے کرتے ہیں تو ایک زوردار قہقہہ اڑا دیتے ہیں، اور اب بھی گاؤں کے چند وہم پرست دہقانوں کو اس کا یقین نہیں آتا کہ

بیراں صاحب وہی آدمی ہیں جو مُردہ ہونے سے پہلے تھے۔

ع

بڑا مزہ اس ملاپ میں ہے جو صلح ہو جائے جنگ ہو کر

دو مرغی کے چوزے

بیگم نے بازار سے دو مرغ منگوائے تھے، دونوں تھے ابھی کم عمر، مگر خوبصورت، ان کے رنگ برنگ کے پروں پر ایسا معلوم ہوتا تھا کہ نقاشِ قدرت اپنا کمال فنِ مصوری و نقاشی صرف کر رہا تھا۔ ابھی یہ نقش پورے طور پر ابھرے نہیں تھے، دونوں تھے موٹے تازے، اونچے پورے اصلی ذات کے، ہونہار بروا کے چکنے چکنے پات۔ مرغی کے بچے یوں بھی تندرست ہوتے ہیں، لیکن جب ان پر جوانی پر پرزے جھاڑ کر نکھر رہی ہو، اور پروں میں نئے نئے نقش و نگار پھوٹ رہے ہوں تو اور بھی خوبصورت اور دلفریب ہو جاتے ہیں۔

گھر میں دو اور مرغ اور پالتو بطخ بھی تھے مگر یہ دو چوزے سب سے الگ رہتے، صبح سویرے منھ اندھیرے اٹھتے۔ دن بھر آنگن میں دانے اور کیڑے مکوڑے چگتے، کٹورے میں رکھا ہوا پانی پیتے، آپس میں کھیلتے، کلیلیں کرتے، گردن کے پر پھلا کر دو دو چونچ لڑتے اور شام کے وقت ایک بانس کی جھانپے کے اندر بند ہو جاتے تھے۔

جہاں ان کا رین بسیرا ہوتا تھا۔ ان کا دن بھر کا مشغلہ یہی ہوتا تھا کہ کھاؤ پیو، ہوائے تازے ہو اور گھر کی چار دیواری کے اندر جتنا چاہو کلیلیں اور دوڑ دھوپ کرو، مگر باہر نظر اٹھا کر نہ دیکھو کہ کہیں راستے کے کتے نہ جھپٹ لیں، کتنے ہی آدمی ہوتے ہیں جن کی زندگی ان چوزوں کی طرح ہوتی ہے۔

مگر ان چوزوں کا ایک اور دلچسپ مشغلہ بھی تھا، یعنی گھر کی بطوں سے چھیڑ چھاڑ۔ تھے تو ابھی چوزے ہی مگر تھے بطخوں سے نڈر، شائد یہ چھیڑ چھاڑ ان کے لڑکپن اور جوانی کی شوخی اور شرارت تھی، ورنہ یہ عمر اور بزرگوں سے دل لگی! یہ منھ اور مسور کی دال! مگر یہ شوخی اور شرارت بطخوں کے ہی ساتھ ہوتی تھی، بڑے مرغ کے سامنے یہی چوزے بھیگی بلّی بن کر بھاگ جاتے تھے۔ بطوں کی بزدلی اور ان چوزوں کی شرارت بہت مزہ دیتی تھی، یہ ان کو طرح طرح سے چھیڑتے اور پریشان کرتے رہتے تھے کبھی بطخوں کے دلیہ کے کونڈے پر چھین جھپٹ کرنا، کبھی ان کے پانی کے برتن پر دھاوا بولنا، کبھی ان کے بیٹھے وقت چھیڑ چھاڑ کرنا، کبھی ان کے بھاگتے ہوئے پیچھا کرنا، غرض بطخوں کا ان چوزوں سے ناک میں دم تھا، جب کبھی یہ چوزے بطخوں کو بہت دق کرتے، بطخ دوڑ کر ایک پانی کے حوض میں کود جاتے جس میں ہمیشہ آدمی کے کمر برابر پانی

ہوتا تھا اور چوزے حوض کی منڈیر تک آکر رک جاتے تھے، پانی میں تھوڑی دیر ڈبکیاں مار کے اور کلیلیں کر کے بطخیں جب حوض سے باہر نکلتیں تو چوزوں کے ساتھ وہی ٹیں ٹیں، وہی قائیں قائیں، وہی چوزوں کی بندر بھبکیاں اور وہی بطخوں کی بھاگ دوڑ، ان شریر چوزوں کو بھی شائد ان غریب بطخوں کی پریشانی اور دوڑ دھوپ میں کچھ لطف آتا تھا یا یہ کہ یہ ان کی جوانی کی ایک ترنگ تھی، وہ منظر بھی قابل دید ہوتا تھا جب کوئی بطخ "تنگ آمد بہ جنگ آمد" کے مصداق چوزوں سے دو دو چونچ مقابلے کو کھڑی ہو جاتی اور ایک چوزے کا پیچھا کرنے لگتی اور اس کی چوٹی کے پر و بال نوچ لیتی۔ پھر جیسے ہی وہ چوزہ پلٹ کر کھڑا ہو جاتا تو وہ دم دبا کر فرار ہو جاتی تھی، آدمی کی ہو یا جانور کی بزدلی، زندگی کی کشمکش سے راہ فرار ہی سجھاتی ہے۔

یہ دو چوزے نہیں معلوم کس گاؤں کے جھونپڑے میں پیدا ہوئے تھے، دیہات کے گھوروں پر نہ معلوم کہاں کہاں اپنی ماں کے ساتھ ٹامک ٹوئیاں مارتے پھرتے تھے، کس کس کے گھر میں گھس کر اناج چٹ کئے تھے، کہاں کہاں کھیل کود اور اچک پھاند کر بڑے ہوئے تھے نہیں معلوم اب ان کے دوسرے بھائی بہن جن کے ساتھ یہ اپنی دیہاتی ماں کے سایہ میں گھر گھر گھومتے پھرتے تھے کس حال میں ہیں، کہاں رہتے

ہیں اور کیا کھاتے پیتے ہیں، قسمت کی گردش نے ان کو اپنے کنبے سے بچھڑا کر ان اجنبی مرغوں اور بطخوں کے پلّے باندھ دیا تھا، یہی وجہ تھی کہ وہ بطخوں کے ساتھ کھیل کود کر اپنا غم فراق بھول جاتے تھے، رہی انجام کی خبر، نہ بطخوں کو تھی اور نہ ان چوزوں کو۔

غرض یہ چوزے اسی طرح کھیلتے کودتے، اچکتے پھاندتے جوان ہوتے رہے، ایک روز ان کے ساتھ کے دو اور مرغ بیگم صاحبہ کے دوستوں کی دعوت کے نذر ہو گئے، اور بطخوں کے بارے میں بیگم نے اپنے ملازم سے کہا:

"کیوں جی، یہ بطخیں تو انڈے نہیں دے رہی ہیں، پندرہ بیس ہی انڈے دے کر رک دیں، ہم نے ان کو انڈوں کے لئے رکھا تھا نہ کہ کھا کھا کر گھر گندہ کرنے کے لئے۔"

نہ ملازم نے اس سوال کا کوئی تشفی بخش جواب دیا اور نہ بطخوں نے انڈے دئے، نتیجہ یہ کہ چند روز بعد یہ بطخیں بیچنے کے لئے بازار بھجوادی گئیں۔

اب چوزے اکیلے رہ گئے، وہی منھ اندھیرے اٹھنا، دانے اور گری پڑی چیزیں کھانا، کونے کھدرے جھانکنا اور سر مغرب بانس کی جھابہ کے اندر بند ہو جانا مگر اب بطخوں سے دل لگی کا دلچسپ مشغلہ ختم ہو گیا تھا ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ان چوزوں کے دل پر بھی چند روز اُٹھن

بطخوں کی جدائی کا اثر رہا، ادھر بطخوں پر کیا گذری کسی کو خبر نہ ہوئی۔
مگر افسوس ان جوزوں کی جدائی کا دن بھی آ گیا، ایک موقع پر بیگم صاحبہ کو دفعتاً گوشت کی ضرورت ہوئی، شام ہو گئی تھی، بازار میں گوشت نہیں ملا، انھوں نے باورچی سے ایک جوزہ ذبح کر دینے کو کہا، رات کو بیگم کے ساتھ ان کے میاں کے علاوہ بیگم کی ایک سہیلی نے کھانا کھایا، دستر خوان پر دو اور لوازمات کے علاوہ مرغ کا قورمہ بھی تھا کھانا ختم ہونے کے بعد بیگم نے باورچی کو بلا کر کسی قدر برہم ہو کر کہا:

"مرغ تم نے برابر نہیں گلایا تھا حالانکہ جوان پٹھا مرغ تھا۔ ہزار دفعہ تم سے کہا کہ مرغ گل کر مسکہ ہو جانا چاہیئے، مگر ہر دفعہ تم ایک آنچ کی کسر ہی رکھتے ہو۔"

بیچئے، مرغ بے چارہ تو اپنی جان سے گیا مگر کھانے والوں کو مزہ نہ آیا۔
اب ایک ہی مرغ رہ گیا، اونچا پورا، گردن میں خوبصورت رنگوں کا کنٹھا، اونچی اونچی ٹانگوں سے آنگن میں تنہا بھٹکا رہتا تھا۔ اس کی یہ تنہائی غالباً اس کے لئے بھی تکلیف دہ تھی اور دیکھنے والوں کے لئے بھی۔
اب کلیلیں کس سے کرتا، نہ بطخیں ہی رہی تھیں اور نہ وہ اس کا ساتھی رہا تھا، نہ جانے ایک عمر کے ساتھی کی جدائی کا اس کے دل پر کیا اثر ہوا دو روز تک اِدھر اُدھر جھانک جھانک کر بھٹکتے پھرنے سے بھی معلوم

ہوتا تھا کہ ساتھی کے بچھڑ جانے سے اس کو کچھ بے کلی سی ہے لیکن چند روز
میں وہ تنہائی کا عادی ہو گیا۔

جیسے جیسے دن گذرتے گئے اس مرغ پر جوانی کا رنگ و روغن
چڑھتا رہا اور اس پر خوبصورتی نکھرتی گئی جیسے گلاب کا پھول بہار پہ ہو۔
اس کے شباب کی رنگینی کو دیکھ کر ایک عجیب سرور دل میں پیدا ہوتا تھا
جیسے کسی خوبصورت چیز کو دیکھ کر ہوتا ہے، جوانی کی مستی ساون بھادوں
کی دھوپ کی طرح اس کے پر و بال پر چھانے لگی اور اس کی ادائیں
دل میں کھبنے لگیں، وہ ہلکی ہلکی بانگ بھی دینے لگا، جوانی کا نشہ سر چڑھ
کے بولنے لگا۔

نہیں معلوم شباب کی کیفیت حیوان میں کس قسم کی ہوتی ہے!
کیا وہی ایک طرح کا خوشگوار ابھرتا ہوا احساس جس کا کوئی نام نہیں
ہوتا، وہی رنگین مزاجی اور رنگین خیالی، وہی ہر شئے کا ایک سہانا
تصوّر، وہی ایک میٹھے میٹھے درد کی دل میں کسک جو انسان کے عالم شباب
میں ہوتی ہے، کیا جانور بھی قدرت کے اس لطیف احساس کا متوالا
ہوتا ہے؟ کیا اس کا بھی کوئی محبوب و معشوق ہوتا ہے جس کے لئے اس
کے نالے بھی "باعثِ افزائش دردِ دروں" ہوتے ہیں؟ کیا اس کی دنیا
میں بھی غم و اندوہ کے ویسے ہی بادل چھائے رہتے ہیں جیسے انسانی

زندگی کے آسمان پر؟ زندگی کا یہ چمن جانور کی نظر میں کیسا دکھائی دیتا ہے؟ ؎

یہ چمن در چشمِ ما یک موجِ رنگ است
کہ می داند بچشمِ بلبلاں چیست

(اقبال)

ایک روز یہ مرغ مکان کے برآمدے میں چڑھ آیا تو بیگم نے جو برآمدے میں بیٹھی ہوئی تھیں، غصّے میں آکر ہش ہش کہہ کر اس کو نکال دیا۔ لمبی لمبی ٹانگوں سے سر جھکائے اس کا آنگن کی طرف سرپٹ بھاگنا چشمِ عبرت کے لئے عجیب منظر تھا، وہ جس کی جوانی کے رگ پٹھے اتنے قوی اور بازو اتنے مضبوط تھے، جس کی ہیبت سے بطخ ڈرتے بھاگتے پھرتے تھے، وہ جوانی سے ساتھیوں میں سینہ تانے ہوئے شاہانہ شان سے چلتا پھرتا تھا بیگم کے ایک ہش کہنے پر یوں حواس باختہ ہو کر بھاگ جائے! پندارِ شباب کی یہ شکست اور سرنگونی، خواہ آدمی کی ہو یا حیوان کی بُری لگتی ہے۔

ایک دن وہ گھڑی بھی آگئی جب ہر ذی روح کی طرح اس مرغ کو بھی اس دنیا سے جانا تھا، بیگم صاحبہ نے ایک اور دفعہ باورچی کو بلا کر کہا سنبھلے خاں، آج رات کو صاحب خانہ کے دو دوست کھانا کھائینگے

روٹی، خشکہ کے ساتھ شکم پُر اور دم کا مرغ رہے گا، ایک سالن اور ایک آدھ میٹھا، مرغ ذبح کرا دو، مگر ہاں، مرغ کو خوب گلانا سمجھے!"

اس حکم کی تعمیل میں مُرغ کو پکڑ کر جھانپ میں بند کر دیا گیا اسکے بعد کسی نے اس کی صورت نہ دیکھی، البتہ گھر کے آنگن میں رنگ برنگ کے چند مشت پَر نظر آئے، اس روز سے گھر کا آنگن سونا ہو گیا۔

———(ختم)———

ایک تاریخی گورستان میں

(بمقام بیدر)

"اے خوابِ گراں کے متوالو! اے آغوشِ لحد میں سونے والو!

تمہیں ایک راہ گیر کا سلام!"

"غٹرغوں، غٹرغوں، غٹرغوں غٹرغوں"

میری آواز پر کبوتروں نے جو گنبد کے اندر کے سقف و بام میں گھونسلے بنا کر بسیرا کر رہے تھے کچھ اس طرح غٹرغوں، غٹرغوں کی آواز نکالی جیسے کسی نے قبر کے اندر سے میرے سلام کا جواب دیا ہو۔

یہ ایک شاہی یا امیرانہ گورستان ہے، قبروں میں سونے والوں نے اپنے شبستان کے لئے کیسی سندر جگہ پسند کی ہے! چار طرف جنگل میدان سبزہ زار، دور دور سفید و سیاہ مقبرے، ہلکے ہلکے عطر آمیز ہوا کے جھونکے ایک وسیع اونچا چبوترہ، چبوترے پر اونچی گنبد اور گنبد کے چار طرف اونچی اونچی کھلی کمانیں، صبح و شام مہرِ عالم تاب ان قبروں پر کرنوں کی چادر بچھاتا رہتا اور میدانی ہوا کے خشک جھونکے پنکھا جھلتے

رہتے ہیں، گنبد کے اندر ایک سنگ اسود کی قبر کسی امیر کبیر کی ہے جس نے
چاند کے حساب سے ۹۸۷ھ ہجری میں اس دار فانی سے کوچ کیا تھا اسکے
بائیں بازو ایک قبر شائد اس کی بیوی کی ہوگی اور دائیں بازو دو قبریں
شائد اس کے دو بیٹوں کی۔ ان قبر میں سونے والوں کی یہی آرزو ہوگی
کہ مرنے کے بعد بھی وہ ایک ہی جگہ رہیں گے، ایک ہی قبرستان بسائیں گے،
یہ گنبد امیر نے مرنے سے تین سال پہلے بنائی تھی اور کیا کچھ توجہ و اہتمام
سے بنائی ہوگی گنبد کے اندر کی دیواروں پر اوپر کے حصے میں فارسی
اشعار، رباعیاں اور قطعات زندگی کی بے حقیقتی پر فنا کا درس
دے رہے تھے، کچھ نقش و نگار مٹ گئے تھے اور کچھ مٹ رہے تھے،
لطف یہ ہے کہ یہ سارا اہتمام دست فنا کی دست درازیوں سے بچنے
کے لئے کیا گیا تھا۔

اس امیر کبیر نے جو موت میں بھی حسن و جمال اور بقا اور ہمیشگی
ڈھونڈھتا تھا مرنے سے تین سال پہلے اس گنبد کی تعمیر کروائی تھی یہ
سمجھ کر کہ زمانہ کی رواداری اور تباہ کاری میں کم از کم اس گنبد کا
اور اس گنبد سے اپنا اور اپنے اہل خاندان کا نام و نشان رہ جائے گا
مرنے کے بعد بھی زندہ رہنے کی یہ ہوس انسان کا پندار خودی و
خود نمائی نہیں تو اور کیا ہے! اس کے مرنے کے تقریباً چار سو سال بعد

یہ گنبد بھی اپنے بنانے والے کی طرح فنا کا درس دے رہی ہے جہاں نہ کوئی فاتحہ پڑھتا ہے نہ عود و گل چڑھتا ہے البتہ مویشی چرانے والے دہقانی لڑکے صبح و شام تھوڑی دیر ٹھیر کر کھیل لیا کرتے ہیں۔

چار سو سال! اتنے عرصے میں کیا کچھ تماشے اور انقلابات اس گنبد کی آنکھ نے دیکھے ہوں گے! بادشاہوں اور حکومتوں کا زوال و عروج، درباریوں کی سازشیں، جنگوں کے معرکے، مغلوں کی تگ و تاز انگریزی تسلط کے ہنگامے، تباہی اور غارت گری، ان حادثات زمانہ کو دیکھ دیکھ کر اس گنبد کہنہ کے در و دیوار کا رنگ اڑ گیا ہے اور یہ اپنی بے ثباتی اور زمانے کی کس مپرسی کی داستان فلکِ خمیدہ پشت کے سامنے دہرا رہی ہے، اس گورستان میں سونے والوں کو کیا خبر ہوگی کہ وہ اپنے شبستان کے لئے کس جگہ کا انتخاب کر رہے ہیں جس کے قریب سے چار سو سال بعد ریل زلف پیچاں کی طرح گذرتی ہوگی اور اوپر سے ہوائی جہاز پتنگوں کی طرح اڑ رہے ہوں گے جن کے شور و غل کی آوازوں سے سکوتِ گورستان کی تنہائی اور خواب لحد کی خاموشی میں مسلسل رخنہ اندازی ہوتی رہے گی۔

میری چشم تصور نے دیکھا کہ یہ امیر جب بقید حیات تھا تو اس نے امورِ سلطنت اور مہماتِ ملکی کی بساط پر تدبیر و مصلحت کے کیسے کیسے

مہرے بڑھائے اور ہٹائے ہوں گے اور قربِ شاہی حاصل کرنے کے لئے اس نے کیسے کیسے جتن کئے ہوں گے! خود اس کے دربار کا کیا رنگ ہو گا اس کے محل میں صبح و شام کیا کچھ چہل پہل ہو گی، نغمہ و سرود کی کتنی ہی محفلیں جمی ہوں گی، اگر اس امیر کو شعر و سخن کا شوق تھا تو اس نے شعر و سخن کے کتنے ہی جلسے بلائے ہوں گے! اس کی آنکھوں نے جاہ و جلال کے، افسردگی و ملال کے، فرطِ نشاط کے اور مسرت و انبساط کے، ننگ و نام کے اور آرزوئے خام کے کیسے کیسے خواب دیکھے ہوں گے! اس تصور سے میرے دل میں اپنی زندگی کے لیل و نہار کی گوناگوں کیفیتیں ابھرنے لگیں اور اپنے ماضی کا ایک سمٹا ہوا نقشہ آنکھوں میں پھرنے لگا۔ اس عالمِ بے خودی میں میں نے اس گورِ امارت کی زبانِ حال سے تاسف بھرے لہجے میں یہ آواز سنی کہ ؎

گذر چکے ہیں یہ لیل و نہار ہم پر بھی

"ہوک!" کہیں قریب کی دیوارِ شکستہ سے شاہ جی اُلّو بولے، ایسا معلوم ہوا کہ کسی قریب کی قبر سے یہ آواز نکلی اور میں سہم گیا۔

شام کا جھٹ پٹا ہو رہا تھا، درختوں اور دیواروں کے سائے گہرے ہو رہے تھے، میرے دل میں خیالات کا ویسے ہی ہجوم تھا جیسے قریب کے ایک درخت پر چڑیوں اور میناؤں کا اژدحام۔ میرا جی اس تنہائی،

اور ویرانی اور مُردوں کی دنیا سے گھبرا اٹھا، اس سنگ و خشت کی گنبد اور ان چار سو سال کے مُردے پالنے والی قبروں کو میرے سازِ دل کی کیا خبر جس کے تار شام کی ہلکی ہلکی خشک ہوا میں زندگی کے کچھ اور ہی نغمے گنگنا رہے تھے، اور میرے دل کا ذرّہ ذرّہ بساطِ خموشی پر آمادۂ رقص ہو رہا تھا۔

جیتا سو ہارا

مثل ہے گھر آئی لکشمی کو بھی نہیں نکالتے مگر انجمن آرا اور گلشن آرا کے ماموؤں نے اپنی بھانجیوں کو ان کے مکان سے نکالنے میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی تھی، ایک سال ہوا کہ انھوں نے تنگ آکر محکمہ رینٹ کنٹرولر میں تخلیہ کا دعویٰ دائر کیا تھا جہاں سے تصفیہ ان دونوں بہنوں کے خلاف ہوا تھا، چونکہ انجمن آرا اور گلشن آرا کو اس جائداد کے بارے میں ادعا تھا انھوں نے رینٹ کنٹرولر کے تصفیہ کے خلاف اپیل کی مگر وہاں بھی ناکامی ہوئی تو انھوں نے تخلیہ مکان کے لئے عدالت سے مہلت مانگی، ابھی اس درخواست پر عدالت سے تجویز نہیں ہوئی تھی کہ انجمن اور گلشن کے ایک قریبی عزیز کے جو طرفثانی کے پیروکار تھے تشدد آمیز برتاؤ اور ہتھکنڈوں کے باعث دونوں بہنوں کو کھڑا کھڑی راتوں رات مکان خالی کرنا پڑا اور وہ ہنگامی طور پر ایک دوسرے محلہ میں مکان لے کر منتقل ہوگئیں۔

انجمن اور گلشن آرا کے ماموں دولت یار خاں اور صولت یار خاں

تھے جنھوں نے ایک سال قبل کیا جاتی دنیا دیکھی کہ یہ قیمتی مکان ایک
شخص غیر کو اونے پونے داموں فروخت کر دیا تھا اور مکان کے خریدار
سے کچھ رقم وصول ہونی باقی تھی کہ میونسپلٹی میں درخواست دے کر
مکان اس کے نام منتقل بھی کرا دیا تھا اس شرط کے ساتھ کہ باقی رقم
مکان پر قبضہ مل جانے کے بعد ادا ہوگی۔

اگرچہ دولت یار خاں کی شادی ہو کر تقریباً تیس برس ہو گئے
تھے لیکن ان کے کوئی اولاد نہیں تھی، دولت یار خاں نے یہ جھونج
ہی نہیں پالا تھا، دونوں بھائی سرکاری ملازمت سے ریٹائر ہونے
کے بعد پینشن اٹھاتے چین کی زندگی بسر کر رہے تھے اور پھر ان کا تعلق
خوش حال خاندان سے تھا مکان ذاتی تھا اور قدیم کم یافتہ خانگی
نوکروں کی سہولتیں حاصل تھیں۔

دولت یار خاں بہت محتاط، نکھی چوس قسم کے آدمی تھے
اور اپنے خاندانی اندوختہ کے علاوہ انھوں نے ملازمت کے زمانے
تک کافی روپیہ پس انداز کیا تھا، اس کے باوجود کھانے پینے رہنے
سہنے میں کم خرچ تھے یہاں تک کہ سگریٹ بھی کم قیمت کے پیتے تھے
ان کی خوش حالی اور کفایت شعاری پر وہی مثل صادق آتی تھی کہ
چنگے ہیں مگر ننگے ہیں۔ اس کے برخلاف ان کے چھوٹے بھائی دولت یار خاں

نے اپنے ماں باپ کی زندگی میں اور ان کے بعد بھی جو بے اللّے تللّے کئے تھے، زندگی کی بہت کچھ بہاریں دیکھی تھیں اور شراب و ساقی کے کوچے کی ہمیشہ سیر کرتے رہے تھے یہاں تک کہ آٹھویں ساتویں بوتل کی بوتل الٹ دیتے تھے، گو ان کا پنشن ضروریات کے لئے کافی تھا مگر شراب کے خرچے کی کمی پڑتی تھی، ان کا مشرب بھی بڑے بھائی کی طرح یہ تھا کہ آپ بھلے تو جگ بھلا، آپ سکھی تو جگ سکھی، غرض ہر دو بھائی اپنی گوں کے یار تھے، ان ہر دو کو اپنے اہل خاندان کے دکھ درد، سکھ چین کا کوئی خیال نہیں ستاتا تھا، یوں دکھاوے کے لئے ان کے قول و فعل میں قرابت اور خلوص کا اظہار آٹے میں نمک کے برابر ہوتا تھا۔

اپیل کا تصفیہ اور مکان کا تخلیہ ہو کر دو مہینے ہو گئے تھے مگر خریدار نے ابھی تک زر باقی رقم ادا نہیں کی تھی، دونوں بھائی خریدار پر تقاضہ کرتے تھے مگر وہ آج کل کرتا تھا۔ انجمن اور گلشن کے وہ قریبی عزیز جو بائع اور مشتری کے بیچ میں تھے، آندھی کے کوّے کی طرح غائب ہو گئے تھے، اوّل ہی مکان کا سودا ان بھائیوں کو جھنگا پڑا تھا، اب اس میں بھی چھ ہزار روپے کی کمی ان کو کھل رہی تھی اور کھلنا ہی چاہئے تھا، رقم دینے کے لئے خریدار کی ٹال مٹول سے تنگ آ کر انھوں نے رقم دلا پانے کے بارے میں وکیل سے مشورہ کرنے کی ٹھان لی، یہ ناحق کی

دوسری ان کے حصّے میں آئی تھی۔

ان بھائیوں کے روزمرہ کے مطابق ان کا ایک آدھ دوست، شناسا اور قرابت دار مغرب کے بعد ان کے ڈرائنگ روم میں جمع ہوتے تھے جن سے گھنٹہ دو گھنٹے خوش گپیاں ہوتی تھیں۔ ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ ان میں سے ایک صاحب نے جو سارے شہر کی خبروں کا ٹھیکہ لئے ہوئے تھے باتوں باتوں میں سنایا:

"سنا ہے کہ خیرات علی صاحب نے اپنی ساری جائداد اپنے بھتیجوں کو تقسیم کر دی ہے یہ بہت اچھا کیا انھوں نے۔"

کہنے والے نے تو یہ خبر دفع الوقتی کے لیے سنائی تھی مگر دولت یار خاں اور صولت یار خاں نے جو بازو کی کرسیوں پر بیٹھے ہوئے سُن رہے تھے، اس کو اپنی بن ماں باپ کی بھانجیوں کے معاملے میں ایک طنز سمجھا کہ دیکھو خیرات علی صاحب نے تو اپنی جائداد اپنی زندگی میں ہی اپنے بھتیجوں کو دیدی اور تم ہو کہ اپنی سگی بہن کی بیٹیوں کو مکان سے نکال کر پریشان کئے ہو۔

صولت یار خاں نے کچھ ناراضگی کے انداز میں کہا: "مگر خیرات علی صاحب کی نہ آل ہے نہ اولاد۔ پھر انھوں نے اپنی ملازمت میں خوب کمایا تھا۔ بھتیجوں کے سوا ان کا ہے کون جس کو وہ جائداد ملتی؟ مرنے کے بعد نہ سہی،

مرنے سے پہلے ہی۔"

"بات آئی گئی ہو گئی لیکن ان دونوں بھائیوں کے دلوں میں یہ بات کانٹے کی طرح کھٹکتی رہی' یہ اپنے دل کے اندرونی گوشوں سے کبھی کبھی یہ آواز سنتے رہتے تھے کہ "کیا تم نے اپنی یتیم و بیسہر بھانجیوں کے حق میں زیادتی نہیں کی؟ کیا ان کو ایک ایسی جائداد کے لئے پریشان نہیں کیا جو خود تمہاری کمائی نہیں تھی بلکہ جس کو تمہارے ماں باپ نے اپنی تمام اولاد کے لئے رکھ چھوڑا تھا' اس کے باوجود جب انھوں نے ایک منھ بولی رقم تم کو دے کر مکان خرید لینا چاہا تو تم نے ان کے اس پیش کش کو کیوں ٹھکرا دیا؟"

اپنے دل کے ان سوالوں کا اُن کے پاس کوئی جواب نہیں تھا کبھی کبھی ان کی اخلاقی شکست کا احساس اس قدر تیز ہو جاتا تھا کہ اُن کو اپنی مقدمہ کی جیت بھی ہار معلوم ہوتی تھی۔

ایک دفعہ ان کے گھر کے قریب کی مسجد میں ملک کے کوئی مشہور واعظ وعظ کے لئے آئے' یہ دونوں بھائی بھی وعظ سننے کے لئے مسجد کو گئے' نماز مغرب کے بعد ایک بزرگ ٹھگنا سا قد' فراخ پیشانی' حنائی ڈاڑھی سر پر چوگوشیہ ٹوپی اور جسم پر گیروے رنگ کا جُبّہ پہنے بغل میں لانبا عصا لئے منبر پر وعظ کے لئے اٹھ کھڑے ہوئے' ان کا نام مولانا

جھجری تھا جو مجتہد بھی تھے۔

انھوں نے وعظ میں دین اسلام کے رکن گناتے ہوئے نماز اور زکوٰۃ کی اہمیت پر زور دیا اور یہ بتایا کہ خلفائے راشدین کے زمانے میں زکوٰۃ کی صورت ایک ٹیکس کی تھی اور یہ کہ قرآن مجید نے زکوٰۃ کا کوئی نصاب مقرر نہیں کیا اور زکوٰۃ کے بارے میں سورہ بقر کے رکوع ۲۵ کے حوالے سے کہا :

"(محمد ﷺ!) تم سے لوگ پوچھتے ہیں کہ کیا خرچ کریں، کہہ دو کہ جو مال بھی خرچ کرو وہ تمہارے ماں باپ کا حق ہے اور قریب کے رشتہ داروں کا اور یتیموں کا اور محتاجوں کا اور مسافروں کا، اور تم کوئی سی بھلائی کروگے تو اللہ اسے جانتا ہے۔"

فاضل واعظ نے بتایا کہ جب اسلام اسلامی سلطنت سے نکل کر ساری دنیا میں پھیل گیا تو ایسے ملکوں میں جہاں اسلامی حکومت نہیں ہے وہاں زکوٰۃ کا کوئی نصاب مقرر نہیں کیا جا سکتا، غیر اسلامی ممالک میں زکوٰۃ کا مقصد قرآنی ہدایت کے مطابق ضرورت مندوں، محتاجوں اور ماں باپ اور قریب کے رشتہ داروں کی حاجت براری ہونا چاہیئے اور خدا جن کو مقدرت دے ان کو یہ حق دل کھول کر ادا کرنا چاہیئے۔

اس تقریر کا اثر دولت یار خاں اور صولت یار خاں کے دلوں پر اس طرح ہوا کہ انھوں نے اپنی بہن کی بیٹیوں کے معاملے اور ان کو مکان سے نکلوانے اور ان کی حق تلفی کرنے کا خیال کر کے دل کا دل میں یہ سوال کیا کہ کیا ہم نے ہمارے ان قریب کے رشتہ داروں کا حق ادا کیا ہے پھر اپنی مرحوم بہن کا اترا ہوا چہرہ ان کے چشم تصور میں پھر گیا۔

ضمیر کی اس خلش سے ان کا احساسِ شکست تیز اور گہرا ہوتا گیا اور ان کی روح جذبات اور خیالات کے کہستانوں میں بھٹکنے لگی وہ خود کو اپنی نظروں میں مجرم سا محسوس کرنے لگے جس سے برات کی اب کوئی صورت نہیں تھی۔

دولت یار خاں کبر سنی اور کہولت کے باعث ضعیف ہو گئے تھے، اور بیمار سے رہنے لگے تھے انکو غدود مثانہ (PROSTATE GLANDS) کی وجہ سے پیشاب بند ہو جانے کی تکلیف ہو گئی تھی اور فربہی اور کبر سنی کے نظر کرتے ڈاکٹر آپریشن کی رائے نہیں دیتے تھے ان کے روحانی کرب و اضطراب پر ان کی یہ جسمانی تکلیف مستزاد تھی۔

دولت یار خاں کو مکان بیچ کر جو روپیہ ملا تھا اس میں سے انھوں نے سات ہزار روپے کے "آبیل کلاتھ لمیٹیڈ" کے شیئر خریدے تھے۔

اس کو کئی مہینے ہو گئے تھے ایک دن حسب معمول وہ شام کے وقت اپنے ڈرائنگ روم میں دو چار دوستوں کے ساتھ بیٹھے ہوئے باتیں کر رہے تھے تو ان کے خبروں کے ٹھیکیدار دوست نے یہ خبر سنائی۔

"سنا ہے کہ "آئیل کلاتھ لمیٹڈ" کے شیئر کی قیمت بہت گر گئی ہے۔ دس روپے کا شیئر ڈھائی روپے ہو گیا ہے، بقول ایک مارواڑی کے شیئر کا پاؤ شیئر ہو گیا ہے کیا کسی نے یہ شیئر لئے تھے"؟

"ہاں، کچھ شیئر میں نے لئے تھے" دولت یار خاں نے اپنی اندرونی گھبراہٹ کو چھپاتے ہوئے کہا "مگر کیا یہ صحیح خبر ہے؟" "آپ سے یہ کس نے کہا؟"

"بھائی جان، آج میں پنشن کے لئے بنک کو گیا ہوا تھا، وہاں دو مارواڑی شیئرز کی کچھ باتیں کر رہے تھے ان میں سے ایک نے اپنے ساتھی کو جہاں دوسری کمپنیوں کے شیئرز کا حال بتا رہا تھا وہاں "آئیل کلاتھ لمیٹڈ" کے بارے میں بھی کہا شاید وہ بھی اس کمپنی کے شیئر لئے ہوئے تھا۔"

جہاں شیئرز اور روپے کے بارے میں مارواڑی کے حوالے سے کوئی اطلاع ملتی ہے تو اس کو صحیح سمجھنا ہی چاہیئے، دولت یار خاں کو اس خبر کی صداقت پر یقین آگیا اور اگرچہ وہ حساب کے کچے تھے دل ہی دل میں اپنے خریدے ہوئے شیئرز کی گھٹی ہوئی رقم کا حساب لگانے کی کوشش کرنے لگے، جب یہ گھٹی ہوئی رقم کا ہندسہ ان کے ذہن میں

آیا تو وہ سہم گئے اور مکان کی جو رقم خریدار سے ملنی باقی تھی اس کا جوڑ اپنے شیر کی گھٹی ہوئی رقم سے ملا کر کچھ سوچ میں پڑ گئے، ان کے دوست برابر ادھر ادھر کی باتیں کرتے رہے اور یہ اپنے ہی خیال میں محو رہ کر ان کی صورت دیکھتے رہے۔

جیسے جیسے دن گذرے ان کے غدۂ مثانہ کی تکلیف بڑھتی گئی بلکہ پیشاب کے رکنے کی وجہ سے ناقابل برداشت ہوتی گئی، سرجن نے آپریشن کا تصفیہ کیا اور ایک روز آپریشن کی تاریخ مقرر کر دی گئی، آپریشن ہوا جس کے بعد چند روز تک ان کی حالت خراب رہی ہر چند علاج کیا گیا انجکشن دئے گئے لیکن وہ جانبر نہ ہو سکے اور آپریشن کے دسویں روز وہ لقمۂ اجل ہو گئے۔ موت نے ان کو جسمانی اذیت اور روحانی عذاب دونوں سے نجات دلائی۔

صولت یار خاں کو ان کے بھائی کی موت کا بہت صدمہ تھا وہ جب کبھی شراب کے نشہ میں غرق نہ ہوتے پچھلے ایک سال کے واقعات اور افکار کے تلخ گھونٹ ان کے دل و دماغ کے کام و دہن میں اترتے رہتے تھے اور پھر تلخابۂ غم کو شراب کے تلخ گھونٹ نوشینہ بناتے رہتے تھے اس طرح ان کا غم غلط ہوتا رہتا۔

بھائی کے مرنے کے ایک مہینے کے اندر صولت یار خاں بھی اچانک

اس عالم فانی سے عالم جاودانی کو سدھارے، وہ ایک روز برآمدے میں آرام کرسی پر بیٹھے یا لیٹے ہوئے تھے کہ دفعتاً ان کے سر میں تڑاق سا درد اٹھا اور وہ بے ہوش ہو گئے۔ گھر والے ان کو اٹھا کر کمرے میں لے گئے اور پلنگ پر لٹا دیا۔ ڈاکٹر کے لئے آدمی دوڑائے گئے، ڈاکٹر چند منٹ ہی کے اندر آ گئے، نبض دیکھی تو کہیں پتہ نہ تھا۔ ڈاکٹر کے آنے سے پہلے ہی ان کی روح پرواز کر چکی تھی۔ ڈاکٹر کی رائے میں دماغ کی کوئی بڑی سی شریان پھٹ گئی تھی جس کی وجہ سے اچانک موت واقع ہوئی تھی۔

گھر میں اس اچانک موت سے کہرام مچ گیا، تھوڑی دیر میں عزیز رشتہ دار اور دوست احباب پہونچ گئے، عصر میں نماز جنازہ پڑھی گئی اور میّت قبرستان پہونچا کر سپردِ خاک کی گئی۔

یہ تو معلوم نہیں ہوا کہ ان دونوں بھائیوں کے روپے کا کیا حساب ہوا البتہ عام طور پر یہ بات مشہور تھی کہ ان کے ایک اور بھائی اپنے بھائیوں کے مال کے مالک ہو گئے ہیں اور اب ایک اچھی خاصی آسامی ہیں۔

انجمن آرا اور گلشن آرا اور ان کے ماموؤں کے تعلقات پر جو پردہ انکی زندگی میں مکان کے جھگڑے کی تاریخ سے پڑا ہوا تھا وہ انکی موت کے بعد بھی نہیں اٹھا۔

—(٭)—

مضامین

مارکس آری لی اُس اینٹونی نس[1]

MARCUS AURELIUS ANTONINUS

ز شعرِ دلکشِ اقبال می تواں دریافت
کہ درسِ فلسفہ می داد و عاشقی ورزید

سلطنت روم کا شہنشاہ مارکس آری لی اُس اینٹونی نس دوسری صدی عیسوی میں اپک ٹے ٹس (EPICTETUS) کے بعد رواقی یعنی (STOIC) فلسفہ کا دوسرا بڑا علمبردار تھا جس نے اپنے فلسفہ کے ذریعے نہ صرف زندگی کا درس دیا بلکہ خود اس کو برتا اور مہمات ملکی اور امور سلطنت کی گھما گھمی میں فلسفہ حیات کے اصول مدوّن کئے اور زندگی اور موت کے نکتے بتائے دنیا میں بہت کم ایسے بادشاہ گذرے ہوں گے جنھوں نے اتنی بڑی سلطنت پر جیسی کہ سلطنت روما تھی جس کی سرحدیں ایک طرف دریائے فرات سے بحر اٹلانٹک تک اور دوسری طرف اسکاٹ لینڈ سے افریقہ تک ملتی تھیں فرماں روائی کی ہو اور اس کے ساتھ ساتھ فلسفہ و حکمت کا لافانی اور نہ بھولنے والا درس بھی دنیا کو دیا ہو یا جس نے اپنی ہستی میں فلسفہ و

1. بحوالہ کتاب "شہنشاہ مارکس آری لی اس اینٹونی نس کے افکار" مترجمہ جارج لانگ

حکمت، علم و عمل اور گفتار و کردار کو ایک مکمل لطیف اور دلکش انداز میں سمویا ہو! جس نے فلسفہ کے گھونگھٹ سے دنیا کو عروسِ زندگی کا جلوہ دکھایا ہو! ع کہ درسِ فلسفہ می داد و عاشقی ورزید

بنوں اور خانقاہوں میں بیٹھ کر دنیا کے لئے ایک مثالی زندگی کا ضابطہ بنانا آسان ہے لیکن کشمکشِ حیات میں داخل ہو کر اس ضابطہ کی پابندی کرنا اور اس کو عملی جامہ پہنانا مشکل ہے۔

یہ جلیل القدر شہنشاہ ۲۶ اپریل ۱۲۱ء کو روم میں پیدا ہوا۔ اسکے باپ کا نام[۱] اینی اَس ویریس اور ماں کا نام[۲] ڈومی شیا کیال ولا یا عام طور پر لوسی لا مشہور تھا، قیصر روم اینٹونی نس پائی اس (ANTONINUS PIUS) اس کا پھوپھا تھا جس نے سیونی[۳] اَس کموڈس اور مارکس اینٹونی نس کو تبنیت میں لیا تھا، اس طرح وہ ان کا منھ بولا باپ تھا، یہ دونوں ۱۶۱ء میں اینٹونی نس پائی اَس کے مرنے کے بعد سلطنت روما کے ایک ساتھ قیصر بنے جو روما کی تاریخ میں پہلی مثال تھی، اگرچہ کموڈس ایک عیش پرست انسان تھا اینٹونی نس اُس کے ساتھ اچھا سلوک کرتا تھا اور اس حُسنِ سلوک کا ہی ثبوت تھا کہ اس نے کموڈس سے اپنی بیٹی لوسی بیاہی تھی۔ ۱۶۹ء میں کموڈس کے مرنے کے بعد عنانِ سلطنت تنہا مارکس آری لی اس اینٹونی نس کے ہاتھ میں آگئی، اینٹونی نس کی یہ غیر معمولی

(DOMITIA CALVILLA)-۲ (ANNIUS VIRUS)-۱

(CEIONIUS COMMUDVS)-۳

خوش قسمتی تھی کہ اس کو اجداد، والدین، بہن، بیوی، استاد، رشتہ دار، ساتھی آشنا، دوست احباب سبھی اچھے ملے تھے جس کا اعتراف خود اس نے اپنی کتاب اوّل میں کیا ہے، اُس نے پہلے شاعری اور بلاغت کی طرف توجہ کی، گیارہ برس کی عمر میں فلسفہ کا درس لیا اور فلسفیوں کا سا موٹا جھوٹا لباس پہننے لگا۔ زہد و ریاضت کی مشقتیں اٹھائیں اور بالآخر شاعری اور بلاغت کے کوچہ کو چھوڑ کر رواقی فرقے میں شامل ہو گیا۔ لیکن اس کے ساتھ اس نے قانون اور فنونِ سپہ گری کی تعلیم بھی حاصل کی جن کا حاصل کرنا امورِ مہمّاتِ سلطنت کے لئے ضروری تھا، روما کی شمالی سرحد پر وہ وحشی اقوام سے جو وقتاً فوقتاً روما پر تگ و تاز کرتی رہتی تھیں، برسرپیکار تھا اور اس نے انکے خلاف ۱۷۹ء میں ایک بڑا معرکہ سر کر لیا تھا کہ اسی معرکہ کے دوران میں وہ بیمار ہو گیا اور یہی بیماری موت ثابت ہوئی، یہاں وہ اپنی عمر کے ۵۹ ویں سال میں بتاریخ ۱۷ مارچ ۱۸۰ء انڈےبونا (ویانا) کے مقام پر ندرِ اجل ہو گیا، بسترِ مرگ پر اس کا بیٹا کموڈس موجود تھا اس کی میّت یا اس کی راکھ روم کو لائی گئی۔

مارکس آرلی اس اینٹونی نس کے عہدِ حکومت میں رومیوں کے مشرکانہ مذہبی اعتقادات اور دینِ مسیحی کے معتقدین میں

ویسی ہی کشمکش جاری تھی جیسی اس کے پیشرو بادشاہوں کے زمانے میں تھی۔ رومیوں کے خیال میں اس نئے دین کے معتقدین سے نہ صرف سلطنت کی بقا کو خطرہ تھا بلکہ ان کے دیوتا اور اعتقادات بھی معرضِ خطر میں تھے، اس کے باوجود اینٹونی نس سے پہلے کے شہنشاہوں کے دور میں (بجز نیرو اور ڈامی ٹشی اَن قیصروں کے جن کو عیسائیوں کے خلاف من گھڑت باتیں کہہ کر اکسایا جاتا تھا) اور خود اینٹونی نس کے دور میں مسیحی پیروؤں کے ساتھ صرف اتنے قصور پر کہ وہ دینِ مسیحی کے پیرو تھے، بدسلوکی کرنے کے ممانعتی ہدایات موجود تھیں اِلّا آنکہ وہ روم شاہی کے خلاف کسی قسم کی بغاوتی کارروائی میں مصروف ہوں لیکن چونکہ دین مسیحی کے پیرو اپنے نئے مذہب کے مقابلہ میں نہ صرف رومیوں کے مشرکانہ رسوم و اعتقادات کے خلاف تھے بلکہ یہود کے اور ایسے تمام رسوم و اعتقادات کے بھی خلاف تھے جن کی سرپرستی سلطنت روما کرتی تھی اور کم مایہ مسیحی پیرو مذہبی جنون میں ایسی حرکتیں کر جاتے تھے جن سے رومیوں کا جذبۂ مخالفت بھڑک اٹھتا تھا اس کے مدنظر اس میں کوئی شک نہیں کہ قیاصرِ روم نے اس نئے مذہب کی مخالفت پر کمر باندھی اور اس کی توسیع اور استحکام کے روکنے کے بارے میں اپنی قلمرو کے حکام اور گورنروں کے نام ہدایات

بھی جاری کیں، ان مخالفتوں اور عداوتوں سے نمٹنے میں قیصر اور اس کے گورنروں کو اپنا بہت سارا وقت ضائع کرنا پڑتا تھا مگر یہ کہنا درست نہ ہوگا کہ اینٹونی نس جیسا شخص جس نے اپنی ذات میں دنیا کیلئے صداقت و شرافت کا مجسّم نمونہ چھوڑا ہے ان مظالم اور مصائب کا شخصی طور پر ذمہ دار ہوگا جو اس کے گورنروں اور ماتحت حکّام نے مسیحی پیروؤں پر توڑے تھے۔

اس کی شہرۂ آفاق کتاب "افکار" یا (REFLECTIONS) جو (MEDITATIONS) کے نام سے زیادہ مشہور ہے، اس میں اُس نے اپنے وہ افکار قلمبند کئے ہیں جو وقتاً فوقتاً اس کے گہرے غور و فکر کا نتیجہ ہیں جو اپنے ہی ذاتی استفادے کے لئے لکھے گئے تھے۔ یہ افکار جو الگ الگ فقروں پر مشتمل ہیں ایک دوسرے سے بے تعلق ہیں۔ اس کے برخلاف رواقی فلسفہ کا دوسرا بڑا علمبردار ایک ٹے ٹس اپنے افکار سیدھے اور آسان انداز میں اپنے سامعین کو سنایا کرتا تھا۔ اینٹونی نس کے افکار میں کوئی تسلسل نہ ہونے کے علاوہ کہیں کہیں ابہام اور تضاد بھی نظر آتا ہے فلسفۂ رواقیت کی بنا ایتھنس میں ۳۰۰ ق۔م میں زینو نے ڈالی تھی جس کی رو سے خیر یا نیکی مقصدِ حیات اور جذبات رنج و الم کے احساس پر قابو حاصل کرنے کا نام ہے، رواقیئین نے اس فلسفہ کی

تقسیم طبیعات، اخلاقیات اور منطق کے شعبوں میں کی تھی جس کے بعد میں چھ شعبے قرار دیے گئے یعنی جدلیات (DIALECTIC) اور بلاغت (RHETORIC) جو منطق پر مشتمل ہیں، اخلاقیات اور سیاسیات، طبیعات اور الٰہیات، اگرچہ فلسفہ کی نوعیت ایک ہے اور جملہ شعبوں کا مقصد واحد کائنات اور حیات کے حقائق کی گرہ کشائی ہے، یہ تقسیم محض عملی اغراض کے لیے کی گئی تھی، اینٹونی نس کے نزدیک فطرت اور کائنات اور اس کے قوانین اور ان ہر دو کے ساتھ انسانی فطرت کی مطابقت کا نام طبیعات ہے۔ کائنات سے مراد وہ تمام اشیاء کا مجموعہ ہے جو عالم کون (COSMOS) ہے یا وہ نظم و ضابطہ جو کائنات میں پایا جاتا ہے وہ مادہ اور عقل میں جسے نفس ناطقہ اور ادراک کہتے ہیں امتیاز کرتا ہے۔ آخر الذکر یعنی عقل مادہ پر حاوی ہے، اس کے نزدیک خدا اور مادہ ابدی ہیں اور خدا نے ہی مادہ کو صورت بخشی ہے اور ہر آن اس کی صورت بدلتا رہتا ہے اور نئی نئی صورتیں بناتا رہتا ہے۔ بقول قرآن حکیم کے "کُلَّ یَوْمٍ ھُوَ فِیْ شَاْنٍ" اینٹونی نس نے فطرت یا نیچر کا مفہوم نظم ضابطہ کے معنے میں لیا ہے، افلاطون کے نزدیک بھی اس کا مفہوم مقررہ نظم و ضابطہ یا مقدر کا ہے، اینٹونی نس خدائی قوت کے ہمہ گیر محرک بہم اور عامل مؤثر ہونے کا قائل ہے، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس کے زمانے کے اعتقادات

کے مطابق وہ دیوتاؤں کو اس خدائی قوت کے عوامل یا ایجنٹس یا مذہبی زبان میں فرشتوں کے معنی میں لیتا ہے لیکن اس کے افکار سے کائنات میں ایک ہمہ گیر خدائی یا ایزدی ہستی کا وجود بھی مستنبط ہوتا ہے جس کی ماہیت الوہی یا ربانی ہے جس کی الوہیت سے ہی انسانی روح بنی ہے یا اس کا ایک حصّہ ہے اور اس روحانی الوہیت کے ذریعہ ہی انسان خدائے برتر اور خیر کل کے قریب پہونچ سکتا ہے۔

مارکس آریلس کے فلسفہ کے مبادیات کی سرسری توضیح کے بعد آئیے خود اس کی زبانی ہم اس کے عملی فلسفہ کے افکار سنیں جو اس نے اپنی کتاب "MEDITATIONS" میں بیان کئے ہیں! یہ کتاب بارہ کتابوں یا حصّوں پر مشتمل ہے چونکہ یہ افکار اس نے اپنے ذاتی استعمال اور استفادہ کے لیے قلمبند کئے گئے تھے اسلئے ابتدائی مسودہ خود اس کے ہاتھ کا لکھا ہوا ہے، کتاب کی ابتدا اس نے ان تمام اشخاص اور دیوتاؤں کے ذکر سے کی ہے جن سے اس کو اپنی سیرت و کردار کی تشکیل میں مدد ملی یہ تمہید بجائے خود اس قابل ہے کہ اس سے قاری اپنی سیرت و کردار کی تشکیل و اصلاح میں استفادہ کر سکتا ہے، مثلاً مشتے نمونہ از خروارے وہ کہتا ہے کہ اس نے اپنے دادا وی اس سے اپنی طبیعت پر قدرت حاصل کرنا اور نیز برگزیدہ اخلاق سیکھے، اپنے باپ کی نیک نامی سے

کسرِ نفسی اور مردانہ سیرت، ماں سے تقدس اور محبت و شفقت اور بڑے کاموں اور بُرے خیالات سے بچنے کی اور سادہ زندگی بسر کرنے کی توفیق حاصل کی، اپنے پڑنانا سے پبلک اسکول کی بجائے گھر کے مکتب میں ہی علم حاصل کرنے کا رجحان پایا، اپنے اتالیق سے منجملہ اور محاسن کے محنت و مشقت اور اپنے ہاتھ سے اپنا کام کرنے کی عادت، قناعت اور دوسروں کے معاملات میں دخل نہ دینے کی عادت اور لوگوں کے خلاف غیبت کرنے اور بہتان باندھنے سے احتراز کرنا سیکھا۔ ایک مشہور رواقی فلسفی رسٹی کس (RUSTICUS) سے منجملہ اور مفید باتوں کے لوگوں کی سخت کلامی اور ایذا رسانی سے بے نیازی اور حلم و عفو خصوصاً جب خود دوسرے اس طرف پہل کریں! غور و خوض سے مطالعہ کرنا اور کسی کتاب کو سرسری طور پر نہ پڑھنا! زیادہ باتونی لوگوں سے گریز کرنا سیکھا! ایک رواقی فلسفی اپولونی اَس (APOLLONIUS) سے جو مارکس آری لیس کا اتالیق تھا، انسانی ارادہ کا آزاد اور مختار ہونا! مستقل مزاجی، صرف عقل و درایت سے مشورہ کرنا اور ناقابل برداشت تکالیف میں، یا اولاد کی موت کے صدمے پر یا کوئی طویل بیماری کی تکلیف میں یکساں حالت میں قائم رہنا! پلوٹارک کے پوتے سکسٹس (SEXTUS) سے خوش خلقی، خوش طبعی خاندان کی مربیانہ سرپرستی، فطری زندگی بسر کرنا وغیرہ

سیکھا، میاکس مس (MAXIMUS) سے جو ایک رواقی فلسفی اور انسانِ کامل کے اوصاف کا حامل تھا، اپنے نفس پر حکمرانی اور کسی بہکاوے میں نہ آنا ہر حال میں اور بیماری میں خوش مزاج رہنا، اخلاق اور کردار میں نرمی اور ملائمت کے ساتھ درشتی اور وقار کو قائم رکھنا اور بلا شکوہ شکایت کوئی کام انجام دینا وغیرہ سیکھا، اپنے منھ بولے باپ قیصر اینٹونی نس پائی اس سے حلم وعفو، نرم مزاجی، متانت اور مستقل مزاجی، جھوٹی شان سے بچنا عام مفاد کے تجاویز کو سننے کے لئے آمادگی، سادگی، خوش کلامی، بات چیت میں بے تکلفی، اپنی صحت کی حفاظت جیسے خصائل سیکھے۔

"MEDITATIONS" کی دوسری کتاب میں جس کو دوسرا حصّہ کہنا چاہیئے مارکس آری لس لکھتا ہے کہ ہر صبح یہ سمجھ کر اٹھو کہ آج میں کسی مفسدہ پرداز سے، احسان فراموش سے، گستاخ اور دیدہ دلیر سے، فریبی سے، حاسد سے، غیر مانوس اور روکھے اور غیر مردم آمیز شخص سے ملنے والا ہوں۔........ نہ ان میں سے کوئی مجھے نقصان پہونچا سکتا ہے اس لئے کہ کسی کی بدی میرا حصّہ نہیں ہوسکتی! نہ میں کسی ہم جنس سے خفا ہو سکتا ہوں اور نہ اس سے نفرت کر سکتا ہوں، اس لئے کہ بنی آدم ہاتھ یا ؤں آنکھ دانت کی طرح امداد باہمی کے لئے بنے ہیں، ایک دوسرے کی مخالفت یا دشمنی فطرت کے خلاف ہے اور ایک دوسرے سے

سرد مہری اور بے رخی سے پیش آنا بھی خلاف فطرت ہے۔

اس بات کو ہمیشہ ذہن نشین رکھ کہ کُل کی فطرت کیا ہے اور تیری فطرت کیا ہے اور دونوں کا کیا تعلق ہے اور یہ کہ میری ذات کُل کا کیسا اور کس طرح جزو ہے اور یہ کہ کوئی بھی تجھ کو ان باتوں کے کرنے یا کہنے سے روک نہیں سکتا جو فطرت کے مطابق ہیں جس کا تو بھی ایک جزو ہے۔

ایک اور فقرہ میں کہتا ہے! کیا عجب ہے کہ اس لمحہ تجھ کو فرشتۂ موت آدبوچے! تیرے فکر و عمل کے پیچھے بس یہی خیال کام کرے، اگر دیوتاؤں کا وجود ہے تو ہم جنسوں سے جدا ہو جانا تیرے لئے کوئی خوف کی بات نہ ہوگی، اس لئے کہ دیوتا تیری برائی کے درپے نہ ہوں گے لیکن اگر ان کا کوئی وجود نہیں ہے یا ان کو انسانی معاملات سے کوئی دلچسپی نہیں تو پھر ایسی دنیا میں رہنے سے کیا ہرج ہے جس میں نہ دیوتاؤں کا وجود ہو اور نہ خدائی طاقت، لیکن سچی بات یہ ہے کہ ان کا وجود ہے اور انسانی معاملات سے ان کو دلچسپی بھی ہے[1] اور انھوں نے انسان کو اس بات کی تمیز و توفیق دی ہے کہ وہ حقیقی برائی سے بچے، اگر درحقیقت دنیا میں کوئی بدی ہوتی تو پھر بھی وہ اس کو یہی قوت تمیزی دیتے، موت و حیات، عزت و ذلت، شادی و غم، اچھے اور برے دونوں قسم کے لوگوں کا مقسوم ہیں۔

---

[1] حضرت علیؓ نے بھی ایک منکر خدا سے خدا کے وجود پر اسی طرح کی منطقی دلیل پیش کی تھی۔

ان سے ہم کو نہ کوئی فائدہ پہونچتا ہے اور نہ نقصان، اس لئے یہ نہ فی نفسہ اچھے ہیں اور نہ برے۔

ایک اور جگہ: انسان کی روح اپنے ہی تئیں نقصان پہنچاتی ہے جب وہ کائنات کا پھوڑا بن جاتی ہے، اس لئے کہ کسی واقعہ سے بگڑنا اور پریشان ہو جانا اپنے آپ کو اس فطرت کل سے علیحدہ کر لینے کے مترادف ہے جس میں تمام چیزوں کی فطرتیں شریک اور شامل ہیں۔ دوسرے وہ روح آپ اپنا نقصان کرتی ہے جو کسی آدمی سے منہ پھیر لیتی یا اسکے درپے آزار ہو جاتی ہے، جیسے غصہ و غضب میں۔ تیسرے، وہ روح جس پر مسرت یا الم غلبہ پا لیتے ہیں۔ چوتھے، جب وہ جھوٹ اور ریاکاری کا جامہ پہنتی ہے۔ پانچویں، جب وہ کسی مقصد یا غایت کے بغیر اور بلا سوچے سمجھے کوئی کام کرتی ہے۔

تیسری کتاب کے ایک فقرہ میں وہ لکھتا ہے کہ تمام چیزوں کو چھوڑ کر ان چند باتوں پر دھیان دے! یہ یاد رکھ کہ ہر شخص صرف حال میں زندہ رہتا ہے جو ناقابل تقسیم لمحہ ہے اور یہ کہ اس کی بقیہ زندگی یا تو ماضی ہے یا غیر یقینی مستقبل۔ لہٰذا وہ وقت جس میں انسان زندگی بسر کرتا ہے مختصر ہے! جس گوشۂ ارض میں وہ رہتا ہے وہ بھی مختصر ہے جس شہرت کے سہارے وہ مرنے کے بعد زندہ رہنا چاہتا ہے وہ بھی

مختصر ہے کہ اس شہرت کو زندہ رکھنے والے خود دیر سویر زیر خاک دفن ہونے والے ہیں۔

ایک اور جگہ: جس طرح طبیب اپنے اوزار کسی موقتی ضرورت کیلئے تیار رکھتے ہیں، اسی طرح تو بھی ایزدی اور انسانی معاملات کو سمجھنے، پرکھنے اور ہر کام کرنے کے اصول ہمیشہ تیار اور مقرر رکھ کہ ایزدی اور انسانی معاملات یکساں ہیں، اس لئے کہ ایزدی معاملات کو سمجھے بغیر انسانی معاملات اچھی طرح سرانجام نہیں پاتے۔ وقس علیٰ ہذا

یہ چوتھی کتاب کے ایک شہ پارے میں موت کی کیسی خوبصورت تمثیل دی ہے، ایک ہی قربان گاہ پر لوبان کے دانے (آتش دان میں) ایک دانہ پہلے گرتا ہے دوسرا اس کے بعد، لیکن اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔

دوسری جگہ کہتا ہے: زندگی ایسے مت بسر کر کہ تجھے دس ہزار سال تک جینا ہے، موت سر پر کھڑی ہے، اس عرصہ میں کہ تو زندہ ہے اور تیرے اختیار میں ہے، نیکی کرلے۔ اسی مضمون کا ایک شعر فارسی شاعر سعدی کا بھی خوب ہے ؎

نیکی کن اے فلاں و غنیمت شمار عمر
زاں پیشتر کہ بانگ بر آید فلاں نماند

ایک اور جگہ: اشیا میں تغیر برا نہیں ہوتا لیکن تغیر میں ثبات اچھا نہیں۔

دوسری جگہ کہتا ہے کہ کسی پریشانی کی حالت میں اس خیال کو پیش نظر رکھ: یہ حادثہ کوئی بدبختی نہیں، اگر تو اس کو ہمت اور خندہ پیشانی سے برداشت کرے گا تو یہی حادثہ تیرے لئے فائدہ رساں ثابت ہوگا۔

چھٹی کتاب کے ایک فقرے میں کہتا ہے: جو چیز کہ شہد کے چھتے کیلئے مفید نہ ہو وہ شہد کی مکھی کے لئے بھی مفید نہیں ہوتی۔ اس قول کو خواہ انسانی زندگی پر محمول کیا جائے یا روحانی زندگی پر یا حیات مابعد پر، بہت معنی خیز ہے۔

ایک اور فقرے میں: انتقام کی بہترین صورت یہ ہے کہ تو ظالم اور غلط کار نہ بنے۔

حیاتِ مابعد کے تصور کو آٹھویں کتاب کے ایک فقرے میں سائنٹیفک انداز میں سمجھایا ہے: جو شخص موت سے ڈرتا ہے وہ یا تو اس بات سے ڈرتا ہے کہ اس کے حواس باقی نہیں رہیں گے یا یہ کہ اس کے بعد کچھ دوسرے ہی قسم کا احساس ہوگا لیکن اگر کوئی احساس ہی باقی نہیں رہا تو پھر تجھے کوئی تکلیف بھی نہ ہوگی، لیکن اگر وہاں کچھ اور قسم کا احساس ہے تو تیرا وجود بھی مختلف ہوگا اور تیری اگی امر۔

دسویں کتاب کا ایک نکتہ بھی ملاحظہ طلب ہے: کائنات خواہ ذروں کا اجتماع ہو یا فطرتِ کلی کا نظم وضابطہ، یہ امر یقینی ہے کہ

میں اس کُل کا ایک جزو ہوں جو فطرت کے زیر نگین ہے، پھر میں ایک طرح سے اُن اجزا کا ایک جزو ہوں جو میری طرح ہیں، یہ بات اگر ذہن نشین رہے تو پھر میں ان چیزوں پر قانع ہوں جو کُل سے میرے حصے میں آئی ہیں اس لئے کہ جو چیز کُل کے لئے مفید ہے وہ جزو کے لئے مضر نہیں ہو سکتی اور کُل میں کوئی ایسی چیز نہیں ہے جو اس کے لئے مضر اور غیر مفید ہو یہ اصول تمام جزوی فطرتوں کا اور فطرت کلی کا مشترک اصول ہے، کائنات کی فطرت کا ایک اور اصول یہ بھی ہے کہ اس کو کوئی بیرونی علّت اپنے حق میں مضر ہونے پر مجبور نہیں کر سکتی۔ یہ بات ذہن نشین کرنے سے کہ میں کُل کا ایک جزو ہوں، کوئی واقعہ مجھے افسردہ خاطر نہیں کر سکتا اور چونکہ میرا تعلق ان اجزا سے جو مجھ جیسے ہیں، گہرا ہے، میں کوئی ایسا کام نہیں کرتا جو مُضر سماج ہو بلکہ میں اپنی تمام قوتوں کو مشترک مفاد کے لئے وقف کر دیتا ہوں اور مُضر سے دُور۔ اگر ایسا کیا جائے تو زندگی پُر مسرّت بن جائے گی جیسا کہ کسی شہری کی زندگی ہوتی ہے جس کا عمل تمام شہریوں کے لئے مفید ہو اور جو اپنے اس حصّہ رسدی پر قانع ہو جو اُسے اسٹیٹ سے ملتا ہے۔

پھر گیارھویں کتاب میں یہ پوچھا ہے کہ تیرا ہنر؟ بس نیک بننا، یہ مقصد بجز ان عام اصولوں کی پابندی کے کیسے حاصل ہو سکتا

ہے جس کا تعلق کائنات کی فطرت سے ہے، یا انسانیت کے صحیح نظام سے۔

اگر غور کیا جائے تو یہ افکار کیسے گہرے اور معنی خیز ہیں جو انفرادی اور اجتماعی مادّی اور روحانی دونوں قسم کی زندگی کے ممد ومعاون ہیں۔ مارکس آریلئس کے افکار بے شمار ہیں جو اس کی اس کتاب کے پڑھنے سے ہی معلوم ہو سکتے ہیں جو مجموعی حیثیت سے کائنات اور حیات انسانی کے بارے میں اس کے نقطۂ نظر کے سمجھنے کے لئے ضروری ہے لیکن اس مضمون میں مشتے نمونہ از خروارے، چند افکار ہی پیش کئے گئے ہیں اس کے تمام افکار تو کجا اہم افکار تک کو پیش کرنے کی گنجائش نہیں۔ سائنس اور ٹکنالوجی کے ترقی یافتہ دور کے علمبرداران افکار سے یہ کہہ کر روگردانی نہ کریں کہ یہ ایک پرانے دور کے ہونے کی وجہ سے موجودہ زمانے کے مزاج کے مطابق نہیں ہو سکتے۔ لیکن اس حیرت انگیز مادّی ترقی کے باوجود انفرادی اور قومی قربانگاہوں پر بہت ساری انسانی اور اخلاقی قدریں، قربان کردی گئی ہیں حقیقت یہ ہے کہ بنیادی انسانی قدریں ہر زمانے میں ایک ہی ہوتی ہیں اور ان قدروں کے علمبردار ہی انسانیت کو راہ راست کی نشان دہی کرتے ہیں، اگر دنیا ان سے خالی رہے تو پھر دنیا امن وسکون کی جگہ نہیں بلکہ فتنہ وفساد کا گھر بن جاتی ہے ؎

دہا آباد عالم اہل ہمت کے نہ ہونے سے
بھرے ہیں جسقدر جام وسبو میخانہ خالی ہے

(غالب)

دربار اکبری کے چند نورتن

شہنشاہ اکبر کے سولہویں صدی کے ہندوستان اور ۱۹۶۸ء کے جمہوری ہندوستان کے حالات میں کوئی مماثلت اور مناسبت نہیں ہے لیکن تاریخی تسلسل کے لحاظ سے یہ کہنا بیجا نہ ہوگا کہ اگر ہندوستان کی تاریخ میں عہد اکبری کا باب نہ ہوتا تو آج ہندوستان کی سیاسی اور تمدنی تاریخ ہی دوسری ہوتی۔ شہنشاہ اکبر نے ملک کے باغی اور منتشر علاقوں کو اپنی قلمرو کے زیر نگین لانے کے لئے یکے بعد دیگرے ملک گیری کی جو حیرت انگیز مہمات سر کیں اس سے بڑھ کر اس کی وہ مساعی تھیں جو اس نے ہندوستان کے مختلف الخیال، مختلف النسل اور مختلف المذاہب باشندوں کے دلوں کو ایک رشتہ میں جوڑنے کے لئے روبہ عمل لائیں، وہ حقیقت میں نہ صرف ایک بڑا بہادر اور اولوالعزم بادشاہ تھا جو میدان جنگ میں اپنے سپہ سالاروں سے آگے کی صف میں رہ کر اپنی سرکردگی میں مشکل سے مشکل معرکے سر کرتا تھا بلکہ وہ ایک ایسا مقناطیس صفت انسان بھی تھا جو اپنے آبائی ملک سمرقند و بخارا سے نظریں ہٹا کر ہندوستان کے آب و گل سے ایک متحدہ

قوم کی خمیر اٹھانا چاہتا تھا، اگرچہ وہ پڑھا لکھا نہ تھا اور چودہ برس کی عمر میں اپنے وزیر باتدبیر اور سپہ سالار جان نثار بیرم خاں خاناں کو ہٹا کر اس نے خود حکومت کے اختیارات سنبھال لئے تھے تاہم حدود مملکت کی توسیع کے ساتھ ساتھ اس کے دل میں حقایق اسرار اور فلسفہ و حکمت اور علوم و فنون کے حدود کی توسیع کی کچھ ایسی لگن تھی کہ اس نے اپنے دربار میں نہ صرف رزم کے مردمیدان جمع کئے تھے بلکہ بزم کے مصاحبانِ خاص کو بھی اونچی جگہ دے رکھی تھی جو ایشیا اور یورپ کے شاید ہی کسی بادشاہ کو نصیب ہوئے ہوں گے، اس کی مردآفرین اور مردم شناس نظر نے جہاں مان سنگھ اور زین خاں جیسے سورما اور سپہ سالار فراہم کئے تھے وہاں فیضی اور ابوالفضل جیسے ادیب اور انشا پرداز اور نظم مملکت اور آئین بندوبست کے لئے راجہ ٹوڈرمل جیسا قابل دیوان مقرر کیا تھا اس کا دربار ارباب فضل و کمال، انشا پردازانِ بے مثال اور ماہرانِ علم و فن سے آراستہ تھا جن کے نام تاریخ کے صفحات پر زندۂ جاوید رہیں گے۔ اکبری دربار کے چند باکمالوں کا تذکرہ اس جگہ بے محل نہ ہوگا جس سے یہ اندازہ ہو سکے گا کہ اس کے دربار کے یہ رتن کس پایہ کے انسان تھے اور انھوں نے دربار اکبری کی رونق کو چمکانے کے لئے کیا کچھ کیا تھا!

اگرچہ بیرم خاں خاناں ابتدا میں اکبر کے دادا بابر بادشاہ

کی خدمت میں نوکری سے سرفراز ہوا تھا اور اس کے بعد اکبر کے باپ ہمایون بادشاہ کی خدمت میں رہ کر مغلیہ سلطنت کی بنیاد دوبارہ ہندوستان میں استوار کی تھی لیکن دربار اکبری میں اس کی جگہ درجۂ اول پر اس لئے ہے کہ ہمایون کے ایک حادثہ سے اپانک انتقال کر جانے کے بعد جب کہ اکبر ابھی کم سن تھا تو سلطنت کی استحکام سلطنت کی ابتدا اسی کی شمشیر زنی، شجاعت اور حسن تدبیر کے ہاتھوں ہوئی۔ یہ صحیح ہے کہ جب اکبر نے سلطنت اور حکومت کے اختیارات سنبھالے تو بیرم خاں بوڑھا ہو چکا تھا اور مسندِ وزارت سے ہٹ چکا تھا تاہم اگر اس کی تلوار، اس کی ہمت و شجاعت اور اس کے مصالح انتظامی کمسن بادشاہ کا ساتھ نہ دیتے تو ایک طرف افغان اور دوسری طرف ہیمو کی افواج اس کی سلطنت کا قلع قمع کر دیتیں۔ علاوہ ایک بہادر آزمودہ کار سپاہی ہونے کے بیرم خاں حسن اخلاق، نیک دلی، علم دوستی، سخاوت اور مہمان نوازی کا پتلا تھا۔ دربار اکبری کا یہ زبردست مہرہ اہل نفاق اور چغلخوروں کی بازی میں مات کھا کر بادشاہ کے دل سے اتر گیا اور بالآخر ایک معرکے میں قتل ہوا۔

بیرم خاں کے بعد اس کا بیٹا مرزا عبدالرحیم خان خاناں کم عمری میں ہی دربار اکبری کے سایہ میں پرورش پانے لگا۔ اس کے باپ کے

مرنے کے بعد بادشاہ نے کمال عفو و کرم اور خطا بخشی سے کام لے کر اس معصوم بچے کے حال پر اکرام و اعزاز کی ایسی بارش کی کہ یہ ستم رسیدہ بیٹا باپ کا رنج و غم بھول گیا اور اس نے دربار اکبری میں رزم و بزم کی خدمتیں بجا لا کر اپنی فراست و قابلیت کے ایسے جوہر دکھائے کہ یہ بھی بہت جلد اپنے باپ کی طرح بادشاہ کا معتمد علیہ اور مقرب خاص بن گیا اور ۱۸ برس کی عمر تھی کہ بادشاہ نے اس کو شہزادہ سلیم جہانگیر کا اتالیق مقرر کیا۔

جہاں اکبر بادشاہ کے سپہ سالاروں اور جان نثاروں کا ذکر ہے وہاں مان سنگھ کا نام لئے بغیر آگے نہیں بڑھا جا سکتا۔ اگر اس بہادر راجپوت اور اس کے باپ دادا کی رفاقت ساتھ نہ دیتی تو ہندوستان میں تیموری خاندان کی بنیاد قائم ہونا مشکل تھا۔ راجپوت قوم کے کچھواہہ خاندان کا یہ سپوت راجہ بھاڑا مل کا پوترا اور راجہ بھگوان داس کا بیٹا تھا جس نے اکبر بادشاہ اور شہزادہ جہانگیر کے ساتھ فوج کشی، سپہ گری اور جوانمردی کے وہ جوہر دکھائے کہ ہندوستان کے اکثر راجہ اور راجپوت خاندان اکبر کی اطاعت میں آ گئے اور اکبر کی جان نثاری اور وفاداری کا دم بھرنے لگے یہ وفا اور اخلاص کا بندہ ہر بات میں بادشاہ کے حکم اور مرضی کے تابع رہتا تھا اور جراءت و جان نثاری سے اُس نے ایسے ایسے معرکے سر کئے جن سے سلطنت کو استحکام نصیب ہوا۔ بادشاہ نے بھی اس

جوانمرد کی وفاداریوں کی خوب قدر کی اور اس کو سب سے بڑے منصب ہفت ہزاری اور چھ ہزار سوار سے سرفراز کیا، اور جہانگیر کے بیٹے یعنی مان سنگھ کے بھانجے (خسرو) کی اتالیقی کا اعزاز بخشا۔

دربار اکبری کے دو اور انمول رتن ابوالفیض فیضی اور شیخ ابوالفضل تھے جو شیخ مبارک کے بیٹے تھے، فیضی ۱۵۴۷ء میں جبکہ شیخ مبارک کی عمر (۴۳) برس تھی اور ابوالفضل ۱۵۵۰ء میں آگرہ میں پیدا ہوئے، ان دونوں بھائیوں کے دماغ فیضانِ قدرت سے کچھ ایسے شاداب تھے کہ انھوں نے نہ صرف مختلف علوم و فنون رائج الوقت میں دستگاہ حاصل کی بلکہ وہ بادشاہ کے مزاج اور خیالات میں بھی اس قدر دخیل ہو گئے کہ شاید ہی کسی اور کو وہاں تک رسائی نصیب ہوئی۔ اکبر بھی کمال کا جوہر شناس تھا اس نے ان دو جواہر پاروں کو اپنے دربار میں خاص جگہ دی، فیضی ایک بلند خیال اور شگفتہ مزاج انشا پرداز اور شاعر تھا۔ جس کی لیاقت اور قابلیت نے دربار میں داخل ہونے کے تھوڑے ہی عرصہ میں بادشاہ کا درجۂ مصاحبت حاصل کرنے کی سفارش کی اور وہ ملک الشعرا ہو گیا، اور ابوالفضل بھی میدانِ رزم کا شہسوار جرنیل اور بساط سیاست و تدبر کا شاطر تھا جس نے اپنے فضل و کمال اور انشا پردازی اور بادشاہ کی مزاج شناسی کی بدولت اکبر کا دل ہاتھ میں لے لیا، دونوں بھائی

حکمت و شریعت، علم و دانش اور مہمات سلطنت کے مسائل و مباحث میں حصّہ لینے لگے، ان دونوں بھائیوں کی تیزیٔ طبع اور جوہر ذاتی کی چمک نے امرائے دربار کی آنکھوں کو خیرہ کر دیا تھا اور یہی چمک مخالفین کے دلوں میں رشک و حسد کا شرارہ بن گئی اور ان پر بادشاہ کے مذہبی خیالات کو برگشتہ کرنے اور بے دینی اور کفر و الحاد پھیلانے کے الزامات لگائے گئے، مگر ان دونوں بھائیوں نے اکبر کے دل میں ایسا اعتماد پیدا کر لیا تھا کہ حاسدوں کا حسد انکو نقصان نہ پہونچا سکا۔ بالآخر ابوالفضل شہزادہ سلیم کی مخالفت کا شکار رہا اور شہزادے کے اشارے پر راجہ اجین کے سپاہیوں کے ہاتھوں قتل ہوا۔

تاریخ ہند کا کون ایسا طالب علم ہوگا جس نے راجہ ٹوڈرمل کا نام نہ سنا ہوگا۔ یہ علاقہ اودھ یا پھر پنجاب کے کسی گاؤں کا رہنے والا افلاس و تنگدستی میں پیدا ہوا۔ کم علم، محض اپنی محنت و لیاقت اور سلیقہ و شوق کے سبب پہلے بادشاہ کے متصدیوں میں داخل ہو گیا اور پھر بہت ساری مہماتِ سلطنت میں ہمت و استقلال سے کام لے کر سپہ گری اور سرداری کی وہ شان دکھائی کہ بادشاہ کی جوہر شناس نظروں نے اس کو کشور ہند کا دیوان بنا دیا اور موتمن الدولہ عمدۃ الملک راجہ ٹوڈرمل کے خطاب سے سرفراز کیا۔ اس وزیر با تدبیر نے قوانین وزارت اور آئین سلطنت مالیات، مالگذاری، بندوبست آراضی اور حساب کتاب کے وہ قاعدے

اور ضابطے مدوّن و متعین کئے کہ آج بھی اس کی وضع کردہ اصطلاحیں مالگزاری بند و بست اور حساب کتاب کے کاغذات میں موجود ہیں۔

مہیش داس راجہ بیربر دربار اکبری کا ایک اور رتن تھا جو غالباً بادشاہ کا سب سے عزیز اور چہیتا مصاحب سمجھا جاتا تھا۔ یہ قوم کا برہمن اور بعض کہتے ہیں کہ بھاٹ تھا۔ شہروں میں گھوم کر گیت کہتا اور گیت گاتا تھا کہ اتفاق سے کہیں بادشاہ سے مل گیا اور اپنے چٹکلوں لطیفوں اور زبانی جمع خرچ اور سب سے بڑھکر بادشاہ کی مزاج شناسی سے جلد بادشاہ کا تقرب خاص حاصل کر لیا۔ بادشاہ نے دو ہزاری کے منصب اور ہزاروں لاکھوں کے جواہر اور صاحب و السیف و القلم کے خطاب سے سرفراز فرمایا۔ پشاور کے مغرب میں سواد اور باجوڑ کے علاقہ میں افغان سرشوری کر رہے تھے۔ اکبر نے ان کی سرکوبی کے لئے ایک مہم زین خاں سپہ سالار کی سرکردگی میں روانہ کی۔ پہاڑی لڑائی میں جس کے پٹھان ماہر تھے، شاہی فوج کا پلہ دب رہا تھا، زین خاں نے بادشاہ سے کمک کی درخواست کی، بادشاہ نے مزید لشکر توپ خانہ کے ساتھ روانہ کرنے کا حکم دیا جس کی سرکردگی کے لئے بیربر کے نام قرعہ پڑا، جب یہ لشکر توپ خانہ کے ساتھ وہاں پہونچا تو بیربر اور زین خاں کے ابین نقشۂ جنگ کی ترتیب میں اختلاف اور باہمی نفاق کے باعث یہ مہم ناکام

رہی اور افغانوں کے ہاتھوں شاہی لشکر کو ایسی فاش شکست ہوئی کہ ہزاروں کی شاہی فوج تذراجل ہوگئی اور اسی بھگدڑ میں بیربر بھی ایسا گم ہوا کہ لاش تک کا پتہ نہیں ملا، بادشاہ کو اس کی موت کا بہت صدمہ ہوا اور اس نے کئی دنوں تک اس کا سوگ منایا۔

ان کے علاوہ اکبر کے دربار سے حکیم ابوالفتح، حکیم ہمام، شیخ فتح اللہ شیرازی، شیخ مبارک، اللہ اور شیخ عبدالقادر بدایونی جیسے اہل علم وکمال اور تان سین جیسے مغنّی اور شیخ منجھو جیسے قوال وابستہ تھے حقیقت یہ ہے کہ اگرچہ اکبر بادشاہ روایتی تحصیل علم سے بہرہ مند نہیں ہوا تھا لیکن یہ اس کے عظمت وجلال اور روشن دماغی کا ہی ثبوت تھا کہ اس نے ایسے علماء فضلا، عقلا اور موجدان فن کو اپنے دربار کے حاشیہ نشینوں میں جگہ دی تھی جن کو اگر حالات زمانہ نے مہلت دی ہوتی تو وہ اپنے وقت کے سقراط و بقراط اور افلاطون و جالینوس ہوتے۔ ملک گیری اور توسیع واستحکام سلطنت کے لئے حیرت انگیز معرکہ آرائیوں اور فتوحات کے علاوہ علم وفن کا یہی شوق ذوق اور اہل کمال کی قدردانی کا یہی جذبہ تھا جس نے عہد اکبری کو چار چاند لگا دئے تھے۔ مشہور انگریزی ادیب تیج جی ویلیز نے اپنی شہرۂ آفاق کتاب "تاریخ عالم" میں اس بادشاہ کے عظمت وجلال کا یوں اعتراف کیا ہے کہ یہ جلیل القدر بادشاہ

حقیقت میں ایک بڑا انسان تھا اس کی با بہ الامتیاز خصوصیت اسکی وہ اعلیٰ ظرفی اور کشادہ دلی تھی جس کی بدولت وہ چاہتا تھا کہ ہندوستان کا ہر عالم فاضل قابل آدمی خواہ اس کا تعلق کسی طبقہ اور مذہب سے ہو اور جو ملک کے استحکام و ترقی اور فلاح و بہبود کے لئے کار آمد ہو سکتا ہو اسکے دربار اور اس کی بساط سلطنت و حکومت سے منسلک رہے، مختلف قوموں اور افراد کا اتحاد اور یکجہتی اور صلح جوئی اور امن پسندی اس کی گویا فطرت سی تھی۔

یہ تھے اکبری دربار کے گلدستہ کے چند پھول جن کی مہک اب بھی تاریخ ہند کے صفحات سے آتی ہے، ان کے علاوہ اور بھی پھول تھے جو اس گلدستہ میں شامل کئے جا سکتے تھے لیکن ان کے تذکرے کی اس مختصر مضمون میں گنجائش نہیں ہے، ان کے تذکرے سے میرا مقصود عہد اکبری کے رزم و بزم کا نقشہ کھینچنا نہیں تھا بلکہ ان سورماؤں، سرداروں اور صاحبان فضل و کمال کی ایک جھلک دکھانا تھا جن کے ہاتھوں نہ صرف مغلیہ سلطنت کا استقرار و استحکام عمل میں آیا بلکہ علوم و فنون، فلسفہ و حکمت، شریعت و معرفت کے مسائل و مباحث کی گھما گھمی کے ساتھ ساتھ ایک ملی جلی تہذیب کے نقش و نگار معرض ظہور میں آئے۔ نہ صرف تاریخ ہند کے طالب علم بلکہ جمہوری دور کے مدبر اور مبصر عہد اکبری کے واقعات اور مدبرین کے

کارناموں کے مطالعہ سے بہت کچھ بصیرت حاصل کر سکتے ہیں اور اس عہد کے نشیب و فراز سے واقف ہو کر ایک ایسی شاہ راہ کی بنیاد ڈال سکتے ہیں، جو پچھلی شاہ راہ کا تسلسل و توسیع ہو، لیکن جرمنی کے مشہور فلسفی ہیگل کے الفاظ میں ہمیں تاریخ یہ بتاتی ہے کہ ہم تاریخ سے کچھ نہیں سیکھتے، پچھلی دو عالمگیر جنگوں کے بعد کی تاریخ سے ہمیں اس فلسفی کے قول کی صداقت سے انکار بھی بن نہیں پڑتا۔ پھر تاریخ عہد اکبری کے پرانے صفحات کو پلٹنے کی فرصت کسے ہے اور اس کی ضرورت بھی کون سمجھتا ہے۔

—(ختم)—

موت کے بعد

مرنے کے بعد کیا ہوگا؟ جسم سے جُدا ہو کر روح کہاں جاتی ہے بشرطیکہ روح کی قسم کی کوئی چیز ہو؟ کیا عالمِ اجسام کے مقابل کوئی عالمِ ارواح ہے؟ اگر عالم ارواح کا وجود ہے تو پھر وہ کس قسم کا عالم ہے؟ اور اگر ایسا کوئی عالم نہیں ہے تو کیا عناصرِ جسمانی تحلیل ہو کر یہیں منتشر ہو جاتے ہیں؟ کیا مرنے کے بعد انسانی شعور باقی رہتا ہے؟ موت کا آخر کیا راز ہے؟۔

یہ اور اسی قسم کے پیچیدہ سوالات ہر انسان کے دل میں پیدا ہوتے ہیں، خواہ وہ مُلحد ہو یا مشرک، بت پرست ہو یا موحد، عالم ہو یا جاہل، فلسفی ہو یا سائنس داں، جوان ہو یا بوڑھا، مرد ہو یا عورت۔ اور وہ اپنی اپنی سمجھ بوجھ اور شعور کے مطابق ان سوالات کے کچھ نہ کچھ جواب معلوم کر کے اپنے آپ کو مطمئن کر لیتے ہیں۔ شاعر اقبال نے بھی شاعرانہ انداز میں اپنی نظم "خفتگانِ خاک سے استفسار" میں کچھ اسی قسم کے چبھتے ہوئے سوالات کئے ہیں:

اے مئے غفلت کے سرمستو کہاں رہتے ہو تم؟
کچھ کہو اُس دیس کی آخر جہاں رہتے ہو تم

وہ بھی حیرت خانۂ امروز و فردا ہے کوئی؟
اور پیکارِ عناصر کا تماشا ہے کوئی؟

آدمی واں بھی حصارِ غم میں ہے محصور کیا؟
اُس ولایت میں بھی ہے انساں کا دل مجبور کیا؟

واں بھی جل جاتا ہے سوزِ شمع پر پروانہ کیا؟
اس چمن میں بھی گل و بلبل کا ہے افسانہ کیا؟

(چند اشعار چھوڑ کر)

واں بھی انساں اپنی اصلیت سے ہیں بیگانے کیا؟
امتیازِ ملت و آئیں کے دیوانے ہیں کیا؟

(ایک شعر چھوڑ کر)

باغ ہے فردوس یا اک منزلِ آرام ہے؟
یا رخِ بے پردۂ حسنِ ازل کا نام ہے؟

کیا جہنم معصیت سوزی کی اک ترکیب ہے؟
آگ کے شعلوں میں پنہاں مقصدِ تادیب ہے؟

کیا عوض رفتار کے اُس دیس میں پرواز ہے؟
موت کہتے ہیں جسے اہلِ زمیں کیا راز ہے؟

اضطرابِ دل کا ساماں یاں کی ہست و بود ہے
علمِ انساں اُس ولایت میں بھی کیا محدود ہے؟

(ایک شعر چھوڑ کر)

جستجو میں ہے وہاں بھی روح کو آرام کیا؟
واں بھی انساں ہے قتیلِ ذوقِ استفہام کیا؟

آہ! وہ کشور بھی تاریکی سے کیا معمور ہے؟
یا محبّت کی تجلّی سے سراپا نور ہے

تم بتاؤ راز جو اس گنبدِ گرداں میں ہے
موت اک چبھتا ہوا کانٹا دلِ انساں میں ہے

ہر مذہب میں حیات بعد از ممات کا کچھ نہ کچھ تخیّل موجود ہے کہیں بہشت کا باغ اور دوزخ کی آگ ہے یا حکومت ربّانی یا دیدار الٰہی کی کوئی صورت اور قہر خداوندی کی کوئی علامت ہے تو کہیں تناسخ کی آواگون اور نروان کی شانتی جو حیاتِ ارضی کے نیک اعمال کی جزا اور بُرے اعمال اور گناہوں کی سزا و تادیب کا مقام یا جزا و سزا سے پیدا ہونے والی کیفیتوں کا نام ہے۔ قبل اس کے کہ ہم موت کی سرحد کے اس پار نظر ڈال کر کچھ دیکھیں۔ آئیے، یہ دیکھیں کہ خود موت ہے کیا چیز!
مادّیت کے پرستاروں کے نزدیک زندگی "عناصر میں ظہورِ ترکیب" اور موت "انہی اجزا کے پریشاں ہونے" کا عمل ہے اور بس، جو اسی دنیا میں نذرِ آتش ہو کر کاربن اور گیاس یا خاک میں مل کر حشرات الارض

بن جاتے یا گل بوٹوں کی خوراک کا کام دیتے ہیں، ہندوستان کی الہامی کتاب بھگوت گیتا میں لارڈ کرشنا کے قول کے مطابق موت گویا تبدیلِ لباس کا نام ہے کہ روح جسم کا پرانا لباس اتار کر نیا لباس پہن لیتی ہے یعنی یہ کہ موت زندگی کا خاتمہ نہیں بلکہ پیدائش کا انجام ہے۔ اسلام میں قرآن کے نقطۂ نظر سے انسان کی تخلیق ایک ارتقائی عمل ہے جو کئی منزلوں سے گذرتا ہے اور ہر منزل کے درمیان موت مقرر کر دی گئی ہے، انسان ان منازلِ ہستی کو درجہ بدرجہ طے کرے گا اور منزل بہ منزل اسکی حیات ترقی کرتی رہے گی، موت کی یہ ایک اخلاقی اور روحانی توضیح ہے اسی نقطۂ نظر کو اقبال نے یوں بیان کیا ہے ؎

موت تجدیدِ مذاقِ زندگی کا نام ہے

خواب کے پردے میں بیداری کا اک پیغام ہے

مہاتما بدھ بھی پنر جنم (تناسخ) میں یقین رکھتے تھے، ان کے نزدیک صحیح طور پر جسمانی خوشیوں اور نفسانی خواہشات کو ترک کر کے اپنی روحانی ہستی کو بہتر سے بہتر بنانے کی کوشش کرنا اور دل کی ایسی پرسکون حالت حاصل کرنا جس میں دل پاپ کرنے کے لائق نہیں رہتا، یہی نروان ہے۔

موت کی یہ حیاتاتی اور اخلاقی تعبیریں خواہ کیسی ہی دلچسپ ہوں، سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا جسمانی لحاظ سے موت ایسی ہی ہیبتناک

اور تکلیف دہ ہے جیسی انسان خیال کرتا ہے، یا یہ کہ انسان موت سے ان تکالیف کو منسوب کرکے جو محض بستر مرگ کے آلام و آزار کا حصّہ ہوتے ہیں یا اُس نامعلوم و نامشہود عالم کے خوف سے جس کی سرحدوں میں داخل ہونے کے بعد بقول شیکسپیر کے، کوئی مسافر واپس نہیں آتا، یا یہ کہ تمام دنیوی رشتوں کے چشم زدن میں ٹوٹ جانے کے خیال سے وہ موت کی ایک ڈراؤنی تصویر آنکھوں کے سامنے کھینچ لیتا ہے، یہ صحیح ہے کہ زندہ رہنے کی خواہش ایک جبلّی فطرت ہے جس کی تکمیل میں موت مزاحم ہوتی ہے لیکن اس مزاحمت میں مرض کی وہ تکالیف اور خوف وہراس رنگ بھر دیتے ہیں، جن کا خود موت سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ بلکہ موت تو ان تکالیف اور خوف وہراس کا خاتمہ کرتی ہے جن کا تعلق زندگی سے ہے اور ایک ایسے نامعلوم دنیا کا راستہ کھول دیتی ہے جہاں کی زندگی میں خدا جانے کیسے کیسے لامحدود اور غیر متناہی تجربے اور تجلّیاں موجود ہیں، ایک طرف نیم مذہبی تصوّرات نے انسان کے سر پر ناقابل معافی گناہوں اور خطاؤں کا بوجھ لاد کر اور دوسری طرف ڈاکٹروں اور طبیبوں نے اس نظریہ کے تحت کہ بیمار کو مرنے تک زندہ رکھنا ان کے پیشے کا اخلاقی فرض ہے، خود مریض اور اس کے تیمارداروں کے لیے موت کو ایک بھیانک اور تکلیف دہ صورت دے رکھی ہے، نپولین نے خوب کہا ہے کہ ڈاکٹر

اور مذہبی پادری موت کو بیحد المناک اور درد انگیز بنائے ہوئے ہیں۔

اب آئیے! ہم موت کی سرحد پر کھڑے ہو کر حیات مابعد کی ایک جھلک دیکھنے کی کوشش کریں، ہم نے اوپر کی سطروں میں یہ تو دیکھ لیا کہ قبر کے اس جانب موت کی تلخی کا تعلق یا تو اس تکلیف سے ہے جو مرض کے باعث آدمی کو برداشت کرنی پڑتی ہے اور جس کی گھڑیوں کو طبیب اور معالج اپنے فن کی مدد سے آخر وقت تک طویل بناتے رہتے ہیں، یا پھر محبوب دنیوی رشتوں سے آناً فاناً رشتہ توڑ کر ایک ایسے گمبھیر اندھیرے میں گم ہو جانے کے خوف سے ہے جس کا حال باوجود مذہبی اور علمی تاویلات کے صحیح طور پر کسی کو کچھ معلوم نہیں، ہم لحد کے دوسری طرف کی جو جھلک دیکھیں گے وہ کسی سائنس کے مشاہدے اور تجربے کی بات نہیں ہوگی، اس لئے کہ جہاں سائنس کے حدود ختم ہوتے ہیں وہاں سے حیات مابعد کی سرحد شروع ہوتی ہے لیکن یہ نہ سمجھنا چاہیئے کہ محض اس وجہ سے حیات مابعد کے تصوّرات خیالی تک بندیاں ہی ہیں، سائنس نے اب تک قدرت کے رازہائے سربستہ سے پردے کا ایک کونا ہی اٹھایا ہے اور کائنات کے نامعلوم اسرار اسکے معلوم شدہ اسرار کے مقابلے میں سمندر اور قطرہ کی مانند ہیں بعض فلسفیوں اور عالموں کا قول ہے کہ ذہن انسانی کی انتھک کاوشوں کے باوجود ان نامعلوم حقائق کے بیشتر حصہ تک عقل انسانی کی کبھی بھی رسائی نہ ہو سکے گی۔

اور جس طرح سلسلہ کہسار میں پہاڑوں کی ایک چوٹی پر پہونچنے کے بعد اس کے پیچھے اور چوٹیاں اور ان کے پیچھے اور چوٹیاں نمودار ہوتی ہیں، ٹھیک یہی حال اُن اسرارِ کائنات کا ہے جن کی بے شمار چوٹیاں انسانی عقل کی دسترس سے باہر ہیں اور باہر ہی رہیں گی۔

بلجیم کے مشہور شاعر اور ادیب مارس میاٹرلنک نے اپنی بے نظیر کتاب "ہماری حیاتِ ابدی" میں جو آج سے تقریباً پچاس سال پہلے لکھی گئی تھی حیاتِ مابعد کے جن ممکنات کی جھلک کسی قدر شاعرانہ انداز میں بیانی کرکے دکھائی ہے وہ میرے خیال میں ایسے ہمہ گیر تخیلات کی حامل ہے کہ ان کو سائنٹیفک نہیں تو نیم سائنٹیفک مفروضات کی بنیاد کہا جا سکتا ہے جو کیا عجب ہے، حیاتِ مابعد کی کسی آئندہ تحقیقات کے سنگ بنیاد ہوں کیوں کہ ایسے بے باکانہ تخیلات ہی ٹھوس تحقیقی نظریات کے مبتداثابت ہوتے ہیں، اس مضمون میں جن خیالات کا اظہار کیا گیا ہے وہ اسی ادیب کے بے باکانہ مفروضات سے ماخوذ ہیں۔

میاٹرلنگ نے اپنی کتاب میں حیاتِ مابعد کے حل کی چار صورتیں بتائی ہیں، مطلق فنا! شعور انسانی کے ساتھ بقا! ہر قسم کے شعور سے خالی بقا! کائناتی شعور کے اندر بقا جو انسانی شعور سے مختلف ہوگا۔

اس ادیب کے خیال میں مطلق فنا یا نیستی ناممکن ہے اس لئے کہ

عدم کا کوئی تصوّر ہی نہیں کیا جا سکتا۔ جہاں عدم کا کوئی تصوّر ہوا تو پھر وہ عدم نہیں رہا۔ البتہ ہستی کی نیستی موت ہے جس سے وجود کی صورتیں بدلتی رہتی ہیں، اگر بفرضِ محال عدم یا نیستی کا کوئی وجود ہے تو پھر موت کے بعد انسانی خودی یا روح کے نیست ہو جانے میں کوئی نقصان نہیں۔

دوسری صورت شعورِ انسانی کے ساتھ بقا کی ہے، کیا یہ صورت ممکن ہے؟ شعور اور حافظہ کا تعلق جسم سے ہوتا ہے تو کیا شعور و احساس کے جسم سے علیحدہ ہو جانے کے بعد شعور مابعد میں انسان کی ذات یا خودی کا کوئی احساس باقی رہتا ہے؟ یہ ذات یا احساس خودی نہ تو جسم ہے نہ کوئی مادّہ ہے نہ صورت، پھر کیا یہ احساس خودی جو انسان کے عہدِ طفلی سے لے کر عالمِ شباب و پیری میں بھی مرنے تک قائم رہتا ہے، احساس ادراک اور یاد اور حافظہ اور عمل اور ردِّ عمل کا ایک نقطہ ہے، جس کا سرا رشتۂ حیات سے ہی جڑا ہوا ہے؟ کیا اس نقطہ کو موت کی ظلمت اپنی آغوش میں لے کر مٹا دے گی اور جب حیات مابعد میں یہ نقطۂ اتصال باقی نہیں رہا تو پھر اس ذات کی یا مذہبی اصطلاح میں روح کی بقا سے خواہ اس کے تجربات مابعد کتنے ہی لطیف اور خوش آئند کیوں نہ ہوں، انسان کی ذات یا خودی کو کیا حظ اور فائدہ حاصل ہوگا!

غور کی بات یہ ہے کہ ذہن کے احساسات اور تاثرات اجسام سے

مربوط و منسلک ہوتے ہیں اور جب جسم ہی باقی نہیں رہا تو پھر ذہن کا
چراغ کب روشن رہے گا! کیا ایسا تو نہیں کہ حواس کے ان تاثرات اور
ہمارے وجود کے علاوہ ایک اور ما فوق الادراک شعور بھی ہے جو ایک
بالاتر نفس ہے جس کا شعور جسمانی شعور کو بھی اپنے اندر سمیٹے ہوئے
ہے اس اعلیٰ تر شعور میں نہ صرف پیدائش اور موت کے درمیان کا شعور
داخل ہو گا بلکہ پیدائش سے پہلے بھی اگر کسی قسم کا شعور تھا تو وہ اور اسکے
پہلے کے شعور بھی اس میں مدغم ہوں گے کیوں کہ حیاتِ ارضی کی ہی
ایسی کیا خصوصیت ہے اور اسی کو کیا ایسی اہمیت حاصل ہے کہ ہم
یہ فرض کریں کہ حیاتِ مابعد میں اسی ایک زندگی کا شعور باقی رہے گا
اور دوسرے شعور مٹ جائیں گے! لہٰذا یہ تمام شعور مل کر ایک ایسا مرکب
اور ناقابلِ ادراک شعور پیدا کریں گے جس میں حیاتِ ارضی کا شعور
بھی مدغم ہو گا اور جس میں وہ نئے عالم کے رازہائے سربستہ سے روشناس
ہو گا۔ یہ جامع اور ترتیب یافتہ شعور جس قسم کا بھی ہو گا اس میں اسکے
اجزائے ترکیبی کی انفرادی حیثیت باقی نہیں رہے گی، یعنی یہ کہ حیاتِ
مابعد میں حیاتِ ارضی کے شعور کی انفرادی حیثیت بھی ختم ہو جائے گی
اور بالفرض اگر ایسی حیثیت باقی رہی تو بھی یہ کوئی ہیبت ناک صورت
نہ ہو گی اس لئے کہ جسم کے ختم ہو جانے کے بعد تمام جسمانی اور ذہنی رشتے

بھی ختم ہو جائیں گے۔

اس کے یہ معنی ہوئے کہ حیاتِ مابعد کی دنیا انسانی شعور سے خالی ہوگی یا یہ کہ ایک ایسے شعور سے آباد ہوگی جو انسانی شعور سے مختلف ہوگا یا پھر ہر قسم کے شعور سے خالی ہوگی جو مفروضات کی تیسری اور چوتھی صورت ہے۔

میاٹرلینک کے خیال میں ایک ایسے ہی مختلف شعور کی بقا کا امکان ہے جس میں موجودہ زندگی کا شعور غالباً نہیں رہے گا موجود زندگی کے شعور کا خاتمہ ان تمام مصائب و آلام کا خاتمہ ہوگا جو جسمانی حیات سے متعلق ہیں، اگر ہم حیاتِ مابعد میں سرے سے کسی قسم کے شعور کے وجود سے انکار کر دیں تو اور بات ہے ورنہ ایک لامحدود کونی یا کائناتی شعور کا تصوّر بہرحال ضروری معلوم ہوتا ہے جس میں ہمارا شعور بھی حصّہ دار ہوگا اور یہ شعور انسانی شعور سے مختلف ہوگا۔ شعور اور عقل کا تصوّر لازم وملزوم ہے، یعنی یہ کہ دنیا اور آخرت کی زندگی میں اسی شعور و عقل کے لامحدود خزانہ سے ہی شعور کی حامل ہستیاں مستفیض اور بہرہ اندوز ہوتی رہی ہیں اور رہیں گی، اس لامحدود کونی شعور کے کم و کیف کا حال کوئی محدود انسانی دماغ نہیں جانتا۔ یہ ایک ایسا رازِ سربستہ ہے جس کا علم قدرت ہی کو ہے جسکو فہم انسانی

اسی وقت سمجھ سکے گی جب وہ خود اس بزم راز میں داخل ہو جائے۔

کیا اس بزم راز میں داخل ہونے کی کوئی صورت ہے جب کہ موت جسمانی زندگی کا یہرے سے خاتمہ کر دیتی ہے؟ سائنس کا یہ مفروضہ ہے کہ مادّہ لافانی ہے، اور حرکت اور حرارت و نور کا تموج انمٹ ہے، پھر تصوّر و خیال بھی کیوں نہ لازوال ہو! اسی خیال یا تصوّر کی ایک رَو ایک نئے لافانی شعور کی دنیا میں ایک نئی اور ناقابل ادراک خودی کا مرکز بن سکتی ہے، جہاں یہ احساس خودی اسی طرح درجہ بدرجہ ترقی کرے گا جیسے انسانی خودی عالم اجسام میں کرتی رہی تھی، اس طرح خوب تر اور اعلیٰ تر مقام کی طرف حرکت جاری رہے گی۔ یہی وہ "حیاتِ جمیل" ہوگی جس کی خوش خبری قرآن مجید میں دی گئی ہے کہ "تمہیں ایک پست حالت سے بلند حالت کی طرف درجہ بدرجہ یقیناً لے جایا جائے گا"[۱]۔ اگر ہماری خودی حیاتِ ارضی میں اچھے اور ارفع خواہشات اور خیالات کی حامل رہی ہو تو یہی خواہشات اور خیالات یا ان میں سے کوئی خیال یا خواہش حیات مابعد کے نئے ماحول میں پہونچ کر ایک اور اعلیٰ خودی کا مرکز کشش و اتصال بن جائے گی، حیات ابدی میں داخل ہونے کا امکانی تصوّر، مذہبی انداز میں بھگوت گیتا میں بھی کچھ اس طرح پیش کیا گیا ہے کہ روح جس طرح عالم طفلی و شباب و

---

[۱] "وہ ذہن جس کی تعمیر قرآن کرتا ہے۔" ڈاکٹر سید عبداللطیف

بیری سے گذرتی ہے ٹھیک اسی طرح وہ موت کے بعد ایک دوسرے
جسم میں داخل ہوگی اور کوئی ہستی بھی اس ناقابل فنا ہستی کو فنا نہیں
کرسکتی اور جس طرح آدمی پرانے کپڑے اتار کر نئے کپڑے پہن لیتے ہیں
ٹھیک اسی طرح روح پرانے اجسام کو چھوڑ کر نئے اجسام میں داخل
ہوجاتی ہے اور یہ کہ موت کے وقت جب روح کسی جسم سے رخصت
ہوتی ہے تو وہ اپنے ساتھ وہ تمام صفات اور گن بھی لیجاتی ہے
جن کا ٹھپّہ عالم اجسام کی زندگی میں اس پر پڑ چکا تھا۔ ٹھیک
اسی طرح جیسے بادِ نسیم پھولوں کے ایک کنج سے دوسرے کنج پر گذرتی
ہوئی اپنے دامن میں ان پھولوں کی خوشبو کو لیجاتی ہے۔

میاٹرلنک کے مابعد حیات عالم کے تصورات کی تصدیق جیسا کہ
ہم نے ابھی بتایا ہے، دو بڑے مذاہب کی الہامی کتابوں یعنی قرآن اور
گیتا سے بھی ہوتی ہے، جس سے ان تصورات کی ہمہ گیری ثابت ہوتی
ہے، اس فاضل ادیب کے خیال میں حیات مابعد کی خواہ کوئی صورت
ہو۔ مطلق فنا! یا شعور ارضی کے ساتھ بقا؟ یا شعور ارضی کے بغیر
کوئی مختلف قسم کی بقا۔ ان میں سے کوئی صورت بھی انسانی خودی
کے لئے ناگوار اور باعث تشویش اور ہیبت ناک نہیں ہوسکتی، اس
لئے کہ خواہ اس لافانی کونی یا کائناتی شعور میں ہماری موجودہ زندگی کا

شعور اور احساس ذات باقی رہے یا نہ رہے، ہمارا شعور یا تو کائناتی
شعور میں ضم ہو کر زندۂ جاوید رہے گا، جیسا کہ تصوف اور روحانیت
اور بعض مذاہب کا خیال ہے جس کو مذہبی اصطلاح میں خدا کا نور
یا روح الارواح کہہ لیجئے بمصداق ع عشرت قطرہ ہے دریا میں فنا ہو جانا۔
یا اس لامتناہی کونی شعور کے اندر اس کا اپنا کوئی انفرادی وجود ہوگا
جو اوّل الذکر کا جزو رہ کر اپنی ہستی کے لامحدود ارتقائی منازل طے
کرتا رہے گا۔ دونوں صورتوں میں اس انفرادی شعور کے لئے کسی قسم
کا جوکھم اور خوف و ہراس نہ ہوگا، اس لئے کہ اس لامتناہی شعور میں
جس کا جزو انفرادی شعور ہے کوئی خوف و ہراس اور درد و کرب نہ ہوگا
یہ امر ناقابل تصور ہے کہ انفرادی شعور کسی کرب و بلا میں مبتلا رہے
اور لامتناہی کائناتی شعور اس سے متاثر نہ ہو جب کہ انفرادی شعور
خود اسی کا ایک جزو لاینفک ہے، یہ امر محال ہے کہ جزو متاثر و مجروح
ہو اور کل مطمئن و محفوظ رہے اور یہ بھی محال عقل ہے کہ لامتناہی یعنی
(INFINITY) اپنے آپ کو مجروح اور گھائل کرے جس سے وہ ہمیشہ
مجروح اور گھائل رہے۔ رواقی فلسفہ کے علمبردار روم کا شہنشاہ مارکس
آرے لیس کے ایک معنی خیز قول کے مطابق جو چیز شہد کے چھتے کے لئے
مضر ہو وہ شہد کی مکھی کے لئے مفید نہیں ہو سکتی۔

لیکن یہ سارے قیاسات ہیں، موت کے بعد کوئی شعوری زندگی ہے بھی یا نہیں اور اگر ہے تو وہ فی الواقع کیسی ہوگی، قدرت کا یہ ایک رازِ سربستہ ہے اور رازِ سربستہ ہی رہے گا۔ اس لئے حافظ نے برسوں پہلے کہا تھا ؎

حدیث از مطرب و مے گو، و رازِ دہر کم تر جُو
کہ کس نہ کشود و نہ کشاید بہ حکمت ایں معمّا را

لیکن یہ نکتہ بھی غور طلب ہے کہ اگر موت اور حیات کے مسائل لاینحل نہ ہوتے اور عقل کے لئے کوئی لاینحل مسائل ہی باقی نہ رہتے اور لاتمناہی لاتمناہی نہ رہتی، خیال تو کیجئے ایسی دنیا کا خیال ہی ہمارے لئے کس قدر تکلیف دہ ہے جس میں عقل انسانی نے کائنات کے سارے مسائل اور مشکلات سلجھالئے ہوں اور اس کی تگ و تاز کے لئے کائنات کا کوئی میدان باقی نہ رہا ہو ؎

جو ہم نے دیکھا تو یار آخر ، خدا کی باتیں خدا ہی جانے !

فُٹ پاتھ

فٹ پاتھ ایک ایسا عام فہم اور چالو لفظ ہے کہ اردو ہندوستانی یا کسی زبان میں اس کا ترجمہ کرنا غلط فہمی پیدا کرتا ہے، مثلاً اگر فٹ پاتھ کا ترجمہ پیدل راستہ کیا جائے تو پیدل راستہ نہ صرف فٹ پاتھ کا ترجمہ ہوگا بلکہ کوئی راستہ بھی جو ایک محلّہ سے دوسرے محلّہ کو یا ایک شہر سے دوسرے شہر کو یا شہر سے گاؤں کو پاؤں پاؤں چل کر طے کیا جائے یا خود گاؤں میں یا جنگل میں کوئی پگڈنڈی یا کوئی پہاڑی راستہ پیدل راستہ کی تعریف میں داخل ہوگا، مگر فٹ پاتھ کی تعریف اس پر صادق نہیں آئے گی، پھر پیدل راستہ کا مفہوم فٹ پاتھ ہی ہونا ضروری نہیں ہے کہ لوگ سڑکوں کے فٹ پاتھ پر سے اتر کر سڑک پر پیدل چلتے نظر آتے ہیں، اس لئے نہ فٹ پاتھ پیدل راستہ کا مترادف ہوسکتا ہے اور نہ پیدل راستہ فٹ پاتھ کا، ٹھیٹ اردو یا ہندوستانی بولنے والے حضرات مجھے معاف فرمائیں کہ اسی مشکل کے مدنظر میں نے اس مضمون کا عنوان فٹ پاتھ ہی قائم کیا ہے جو اردو یا ہندوستانی زبان میں خود فٹ پاتھ کے

استعمال سے زیادہ چالو ہے۔

فٹ پاتھ کا تعلق چلنے سے زیادہ دیکھنے سے ہوتا ہے یا پھر ان رکاوٹوں سے جو فٹ پاتھ پر چلنے والوں کو پیش آتی ہیں، آپ گھر سے باہر کسی سڑک پر نکل جائیں جہاں سڑک کے کنارے فٹ پاتھ بھی ہوں تو دیکھیں گے کہ فٹ پاتھ پر سبھی کچھ ہوتا ہے، پٹارے والوں کا سامان کباڑیے کی دکان، پرانے کتابوں اور رسالوں کا دسترخوان، گاہکوں کی سیکلیں، فقیروں کی بیٹھک، زمین پر بیٹھ کر ستاروں کی گردش اور قسمتوں کا حال بتانے والے جوتشی اور رمال، کچرے کی کنڈی، کہیں پوسٹ باکس، کہیں بندر یا سانپ کا تماشہ، غرض سبھی کچھ ہوتا ہے اور نہیں ہوتا تو فٹ پاتھ پر چلنے والا۔ اگر ان رکاوٹوں کے باوجود کوئی نیک بخت سڑک سے ہٹ کر فٹ پاتھ پر چلنے کا تہیہ ہی کرے تو پھر اسکو جگہ جگہ جہاں جہاں فٹ پاتھ کا سلسلہ کسی مکان کی پھاٹک یا دکان یا راستہ کے گذر پر ٹوٹ جاتا ہے وہاں وہاں اس کو فٹ پاتھ پر سے اترنے چڑھنے کی مشق کرتے رہنی پڑتی ہے جس سے اس کا سانس چڑھتا اور پتلون بار بار اترتا رہتا ہے یا کبھی اس نے غفلت کی تو اسی اتار چڑھاؤ میں کہیں اس کے پاؤں کو ٹھوکر لگتی ہے اور وہ اس مشق سے تنگ آکر پھر سڑک پر چلنے لگتا ہے۔

اس کے علاوہ آپ فٹ پاتھ پر یہ بھی دیکھیں گے کہ کوئی کسی ٹھیلے سے موز خرید کر فٹ پاتھ پر ہی کھڑا ہوا موز کھا رہا ہے اور چھلکا اتار کر فٹ پاتھ پر پھینک دیتا ہے، جو لوگ اس حقیر چھلکے سے غفلت برتنے کی جراءت کرتے ہیں وہ اس چھلکے پر سے پاؤں پھسلنے کی گردان کرہوا میں قلابازی کھاتے ہوئے زمین پر چاروں خانے چت آ رہتے ہیں جن سے سڑک کے تماشائی محظوظ اور لطف اندوز ہو رہے ہیں، یا پھر آپ یہ دیکھیں گے کہ چند حسن پرست سڑک کے فریاد فٹ پاتھ پر کھڑے ہوئے ان مہ جبینوں کے آتش حسن سے آنکھیں سینک رہے ہیں جو کسی دوکان سے کچھ ضرورت کا سامان خریدنے کے لئے آئی ہوئی ہیں، یا پھر کوئی ہجوم کہیں فٹ پاتھ پر کھڑا ہوا بس کا انتظار کر رہا ہے اور ان میں سے کوئی پان کھا کر فٹ پاتھ پر پیک لگا رہا ہے، یا کوئی صاحب فٹ پاتھ پر کھڑے ہوئے منھ بنا بنا کر جیسے چھینک آ رہی ہو، فٹ پاتھ پر چلنے والوں سے شانہ رگڑتے ہوئے اخبار کا گہرا مطالعہ کر رہے ہیں اور کبھی ادھر اُدھر پلٹ کر چھینک بھی دیتے ہیں، یا موسیٰ ندی کے پل کے فٹ پاتھ پر آدمیوں کا ایک ہجوم آنے جانے والوں کی راہ میں رکاوٹ بنا ہوا کھڑا ہے اور ندی میں نیچے کی طرف ہر شخص دیکھ رہا ہے، آپ ان میں سے ایک آدمی سے پوچھتے ہیں "بھئی کیا دیکھ رہے ہو" تو اس کو معلوم نہیں،

دوسرے سے پوچھتے ہیں "میاں، ندی میں کیا ہو رہا ہے؟" تو اس کو خبر نہیں اس طرح آپ دس بیس آدمیوں سے پوچھیں تو کوئی کچھ نہ بتائے گا کہ کیا دیکھ رہا ہے۔ بالآخر آپ کو معلوم ہوتا ہے کہ ندی میں کوئی آدمی بطخوں کو لکڑی سے ہنکاتے ہوئے گھر لے جا رہا ہے۔ اگر کوئی دو آدمی بش کوٹ اور چپل پہنے ہاتھ میں چھوٹا چمڑے کا بیاگ لیئے یا بغل میں کاغذ کا پلندا دبائے ہوئے فٹ پاتھ پر کھڑے باتیں کر رہے ہیں تو سمجھئے کہ ان کا تعلق کسی سرکاری دفتر سے ہے، یا کسی فرم سے، یا پھر کسی انشورنس کمپنی کے ایجنٹ ہیں۔

کچھ سیاسی قسم کے جوشیلے نوجوان ہوٹلوں اور رسٹوران کے علاوہ فٹ پاتھ کو سیاسی مباحث کا پلیٹ فارم بنائے ہوئے کھڑے ہوتے ہیں اور فٹ پاتھ پر آنے جانے والوں کا راستہ روک کر کھڑے ہوئے سیاسی مباحث اور گفتگو میں منہمک رہتے ہیں، عوام سے ربط پیدا کرنے یعنی (MASS CONTCT) کا اس سے بہتر کوئی مقام نہیں، یہ بھی دیکھا گیا ہے کہ بعض لوگ جو کسی کم آباد محلّے میں رہتے ہیں اپنے گھر کے جھگڑے سرِ راہ چکانے میں عار نہیں سمجھتے، فٹ پاتھ پر کھڑے ہوئے ایکدوسرے کے گھر کے راز طشت از بام کرتے رہتے ہیں، یہ جنگِ زرگری اس وقت تک جاری رہتی ہے جب تک کوئی بھلا مانس محلّہ والا ان کے بیچ میں پڑ کر فریقین میں بیچ بچاؤ نہیں کر دیتا، یا جب معاملہ ہاتا پائی پر

پہونچ جاتا ہے تو محلّہ والوں کی رپورٹ پر کوئی پولس کانسٹبل موقع پر پہونچ کر دست اندازی نہیں کرتا۔

اس عارضی اور وقتی تصرف کے قطع نظر کہیں کہیں فٹ پاتھ کا دائمی اور مستقل استعمال بھی ہوتا ہے، مثلاً میرے ایک وکالت پیشہ دوست جس محلّہ میں رہتے تھے وہ زیادہ آباد نہیں تھا، ان کا مکان ایک فٹ پاتھ سے لگا ہوا تھا ان کو شکایت تھی کہ ان کے مکان کا آنگن سڑک کی توسیع اور فٹ پاتھ کی تعمیر کے لئے آرائش بلدہ کے محکمہ نے حاصل کر کے بلا وجہ فٹ پاتھ بنا دیا تھا، گو ان کو زمین کا رقمی معاوضہ محکمہ سے مل گیا تھا لیکن اٹھنے بیٹھنے کی جگہ کی تکلیف بہرحال قائم تھی، اس کے مدنظر وہ فٹ پاتھ کو ایک دیوان خانے یا نشست گاہ کی حیثیت سے استعمال کرنے کا خود کو حقدار سمجھتے تھے، چنانچہ گرمی کے موسم میں اور دوسرے موسموں میں بھی جب موسم اجازت دیتا وہ صبح و شام مکان کے دروازے کے سامنے فٹ پاتھ پر دو چار ٹاٹ اور لکڑی کے تختے کی کرسیاں ڈالے دوستوں ملاقاتیوں کی محفل جمائے رہتے تھے اور گرمی کے موسم میں اس محفل کے برخواست ہو جانے کے بعد پلنگ ڈال کر اور پلنگ کو مچھر دان لگا کر سونے کا انتظام بھی یہیں کرتے تھے، ان کا خیال تھا کہ فٹ پاتھ پر اپنے مکان کے دروازے کے سامنے ایک نیم کا یا کوئی جلد بڑھنے والا سایہ دار درخت

لگائیں تاکہ موسم گرما میں دیر تک سوتے رہنے اور اٹھنے بیٹھنے کی تکلیف نہ ہو
چند سال بعد جب میرا ان کے مکان کی طرف گذر ہوا تو میں نے دیکھا کہ ایک
نیم کا درخت ان کے مکان کے دروازے کے سامنے فٹ پاتھ پر لگا ہوا تھا
اور قد آدم بلند ہو گیا تھا۔

قارئین! فٹ پاتھ کے جائز اور ناجائز استعمال کے بے شمار نظارے
خود آپ کی نظروں سے صبح و شام گذرتے ہوں گے، میں کیوں ان کو آئینہ تحریر
میں لاکر آپ کو دکھاؤں اور مفت میں کیوں آپ کا وقت ضائع کروں البتہ
اتنا عرض کردوں کہ شہر کی ٹرافک کے نظام میں فٹ پاتھ کا وجود اسی طرح
ہے جیسے نظام جسمانی میں اپنڈکس (زائد آنت) کا یا پنجۂ انسانی میں
انگشت ششم کا:

بے کارم و باکارم چوں مد بہ حساب اندر

—(÷)—

قدرت کا سرگم

آپ نے قارئین کبھی اس پر بھی غور کیا ہے کہ آپ دن بھر میں کتنی قسم کی آوازیں سنتے رہتے ہیں! نزدیک کی آوازیں، دور کی آوازیں، انسانی آوازیں، حیوانی آوازیں، مشینوں کی آوازیں، غیر مشینی آوازیں، موٹی بھدّی آوازیں، سریلی گرجدار آوازیں، مدھم دلکش آوازیں، کرخت، سامعہ شکن آوازیں، ہلکی آوازیں، بھاری آوازیں، مسرّت و انبساط کے دلنواز نغمے اور رنج وغم کے دلخراش نوحے! غرض بیسیوں آوازیں دن رات آپ کے پردۂ گوش کو ہٹا کر دماغ میں داخل ہوتی اور آپ کو شعوری یا غیر شعوری طور پر محظوظ یا مغموم بہرحال متاثر کرتی رہتی ہیں، یعنی یہ آوازیں یا تو راست آپ کے سطح شعور پر ٹکراتی رہیں گی یا دُور سے شعور کے نیچے یا پیچھے منڈلاتی ہوں گی اور جیسے ہی آپ نے ان منڈلاتی ہوئی آوازوں کی طرف شعور کا دروازہ کھولا، ان آوازوں کا سرگم آپ کے شعور میں داخل ہوا، اور یہ آوازیں بھی مقام اور وقت کے لحاظ سے بدلتی رہتی ہیں، اس بارے میں شہر کی آوازیں دیہات کی آوازوں سے

مختلف ہوں گی جس طرح شہر کا ماحول دیہات کے ماحول سے مختلف ہوتا ہے، اور صبح کے وقت کی آوازیں دوپہر کی آوازوں سے، اور صبح اور دوپہر کی آوازیں، شام اور رات کی آوازوں سے مختلف ہوں گی۔

مثلاً اگر آپ شہر میں رہتے ہوں اور بستر پر صبح سویرے آپ کی آنکھ کھلی ہو، یا یہ کہ آنکھ بند ہو مگر کان کھلے ہوں تو قریب ترین آواز یا گھڑیال کی ٹک ٹک سنائی دے گی یا کسی دیر سے جاگنے والے کے خراٹوں کی آواز یا اگر خراٹوں کی آواز زوردار نہ ہو تو یہ دونوں آوازیں۔ اسکے ساتھ اگر آپ کے مکان میں مرغ ہوں تو صبحدم مرغِ سحر کی بانگ بھی وقفہ وقفہ سے آپ کے کان میں پڑتی رہے گی، یا کسی چڑیا کے سُریلے بول آپ کے مکان کے کسی درخت یا منڈیر سے ہوا میں لہراتے ہوئے آپ کو صبح کی آمد کی خبر دے رہے ہوں گے، جب آپ بستر سے اٹھ کر منھ ہاتھ دھونے کے لئے تیار ہوتے ہیں اور آسمان سے تیرگیٔ شب دور ہوکر وہ معشوق زرنگار یعنے آفتاب عالم تاب جانب مشرق آہستہ آہستہ اپنا سر سطح افق سے نکالے ہوئے شعاعوں کے ہاتھوں کی کشاکش سے کائنات کو بیدار کرتا رہتا ہے، اُس وقت فضا کے ارگن سے نئے نئے سُر نکلنے لگتے ہیں۔ کبھی سڑک پر سے گذرتی ہوئی موٹر کی پوں پوں کبھی دُور سے ریل کے انجن کی بھک بھک اور بھوں بھوں، کبھی

ہوا میں اڑتے ہوئے طیّارے کا فرّاٹا یا پھر کسی دور کی فیکٹری کی سیٹی
کی آواز یا کوئی بم مارٹا نے کا دھماکہ۔ یہ سب آوازیں آپ کو انسانی
کاروبار اور نقل و حرکت کے باقاعدہ طور پر آغاز ہو جانے کی اطلاع
دیتے رہتے ہیں، اس کے تھوڑی دیر بعد مقررہ وقت پر ہمسایہ کے ریڈیو
کی سامعہ شکن آواز کان میں آتی رہتی ہے جس کے ذریعے کوئی گانا یا
گیت یا خبریں نشر ہو رہی ہیں، جیسے جیسے دن چڑھتا جاتا ہے آدمیوں
کے بول چال کی آوازوں، سڑکوں پر موٹروں، موٹر سیکلوں اور گاڑیوں
اور جانوروں کی آمد و رفت کے ساتھ ان کی آوازوں کا سلسلہ جاری
ہو جاتا ہے، پھر جب آپ ناشتہ وغیرہ سے فارغ ہو کر اپنے روزمرّہ
کے کام پر یا شام کی تفریح کی غرض سے باہر نکلتے ہیں تو قسم قسم کی
آوازیں آپ کے کانوں کے راستے دماغ میں داخل ہو کر آپ کو
زندگی کی حقیقتوں سے باخبر کرتی رہتی ہیں۔ مدرسوں اور کالجوں میں
لڑکوں اور لڑکیوں کی اور اساتذہ کی بات چیت اور چیخ و پکار،
کچہریوں میں اہل عملہ کی رفتار و گفتار، بازاروں میں سواریوں اور آدمیوں
کی ہماہمی، سڑکوں پر اور کارخانوں میں مزدوروں کا شور و غل اور
گہما گہمی یہ سب آوازیں زندگی کی حقیقتیں مسلسل آپ کے گوش گذار
کرتی رہتی ہیں، اور پھر آپ کے بستر پر جانے تک یہ سرگم بجتا رہتا ہے۔

قارئین! قدرت نے کان بھی عجیب چیز بنائے ہیں، اگر کان نہ ہوتے تو خیال کیجئے ہم قدرت کی کتنی نغمہ سنجیوں اور انسانی معاشرے کے کاروبار کی کتنی ہنگامہ آفرینیوں اور علوم و فنون لطیفہ کی کتنی سامعہ نوازیوں سے محروم ہی رہ جاتے اور ہماری زندگی کتنی بے صدا اور بے مزہ رہتی! آنکھ اگر "جنّتِ نگاہ" کا کیا مزہ ہے تو کان بھی فردوس گوش کے ارگن ہوتے ہیں، اگر کانوں کے راستے سے ہمارے دل و دماغ کے دروازے بند رہتے تو خیال کیجئے ہمارے اس چھوٹے سے گھر میں جس کو ہم جسم کے نام سے پکارتے ہیں کیسا سکوتِ گورکا سا سناٹا رہتا۔

اور اگر آپ کسی گاؤں کی فضا میں رہتے ہوں تو وہاں آپ کو شہر سے مختلف ہی آوازیں سنائی دیں گی، وہاں اگر آپ کبھی کبھی کسی موٹر یا لاری کے انجن کی پھٹ پھٹ یا ڈور کے انجن کی سیٹی کی آواز یا اونچے آسمان پر اڑتے ہوئے ہوائی جہاز کے فرّاٹے سن لیں تو سن لیں، ورنہ وہاں کی آوازوں کی دنیا ہی اور ہوتی ہے وہاں آپ صبح سویرے منہ اندھیرے ایک طرف سے بکروں اور ڈھوروں کے پکارنے کی اور آدمیوں کے باتیں کرنے کی آوازیں سنیں گے یا پرندوں کے سریلے بول، کہیں سے آپ کو چڑیوں کی چہکار سنائی دیگی، کہیں سے کوّوں کی کائیں کائیں، کہیں سے بطخوں کی قائیں قائیں،

کہیں سے کوئل کی کو کو، کہیں فاختہ کی حق سرّہ، کہیں سے پپیہے کی پی کہاں پی کہاں، کہیں دُور سے جل کُڑکارے کی کوک، کبھی بگلوں کی توتو، کہیں درخت سے طوطے کی ٹیں ٹیں، کہیں میناؤں کی چیر غیو چیر غیو، کسی مکان کی منڈیر سے کبوتروں کی غٹر غوں غٹر غوں، کسی جھاڑی کی ٹہنی سے بُلبُل کی پٹ پڑروں پٹ پڑروں۔ دن میں کسی وقت گاؤں میں جب آپ اپنے مکان کے وراندے میں بیٹھے ہوئے ہوں اور ساون کا مہینہ ہو تو دُور سے آپ کی طرف آتی ہوئی بھونرے یا بھنبھیری کی گونجتی ہوئی آواز سنائی دے گی، یا کسی کونے سے جھینگر نغمہ سرائی کر رہا ہوگا۔

اسی طرح رات کے وقت گاؤں کی آوازیں بھی خاص ہوتی ہیں رات کے وقت کھیتوں کے پانی کے ڈبروں اور چشموں میں بیٹھی ہوئی مینڈکوں کی ٹرٹر، کسی بے برگ و بار درخت یا اجڑی ہوئی عمارت سے چغد یا اُلّو کی ہوک اور نزدیک اور دور سے گاؤں کے کتوں کی بھوں بھوں اور نالہ وزاری اور بین بجاتے ہوئے مچھروں کی یلغار دل میں کچھ عجیب کیفیت پیدا کرتے ہیں یا پھر خاص خاص دنوں میں ایک عارضی اسٹیج سے جس کو پھول پتوں سے سجایا گیا ہو، گاؤں کی کتھاؤں اور ناٹکوں کے مقامی زبان میں گیت اور مکالمے بھی سننے میں آتے ہیں جن کو سادے گاؤں والے بڑے شوق اور انہماک سے سنتے رہتے ہیں۔

لیکن قارئین! یہ آوازیں خواہ شہر کی ہوں یا دیہات کی، ہمارے کانوں کے راستے صرف دماغ کے رگ و پے میں اترتی ہیں، دل کے راستے سے ہو کر دماغ کو نہیں جاتیں یا دماغ کے راستے سے دل میں نہیں آتیں جس کا نتیجہ یہ ہے کہ یہ آوازیں کان اور دماغ کے پردوں کو تو چھو لیتی ہیں لیکن دل کے پردہ ساز کو مرتعش نہیں کر پاتیں، اگلے زمانے کا انسان قدرت کے تماشوں اور نغمہ سنجیوں کو چشم بینا سے دیکھتا اور گوش شنوا سے سنتا تھا اور قدرت کی نیرنگیوں، لطیفہ سنجیوں اور نغمہ سرائیوں سے حقیقی بصیرت اور مسرت و شادمانی حاصل کرتا تھا، موجودہ زمانے کا مزاج ہی کچھ اور ہو گیا ہے اور اس کی روح پر کچھ مادیت سی طاری ہو گئی ہے۔ موجودہ زمانے کا انسان بزم قدرت کے مناظر اور کرشموں کا دل سے مطالعہ کرنے کے بجائے مظاہر فطرت کے علمی اور فنی معلومات کی ایک چلتی پھرتی لغت ہوتا ہے! قدرت کی نغمہ سنجیوں اور "نوائے راز" کو دل کے کانوں سے سن کر محظوظ و مسرور ہونے کے بجائے سینماؤں اور رقص و سرود اور بادۂ عشرت کی محفلوں سے زیادہ لطف اندوز ہوتا ہے، موجودہ دور کا نوجوان کارگاہِ حیات کو زیادہ مفید، بار آور اور دلکش بنانے کے بجائے گوئے و چوگان کے کھیلوں اور گوناگوں تفریحوں میں وقت ضائع کرتا رہتا ہے۔ غرض کہ اس کے احساسات

کی شراب میں وہ تاثیر اور تیزی اور اس کے جذبات اور تاثرات کے
قلب میں وہ گہرائی اور گرمی نہیں جو قدرت سے بالراست ربط اور
تعلق سے پیدا ہوتی ہے، یہ ذہنی اور نفسیاتی مادیت انسان کے مشینی دو
کی پیداوار ہے کیا خوب ہو کہ انسان زمانے کی آواز کے ساتھ ساتھ اپنے
دل کی آواز بھی سنتا رہے۔